دیوانِ غالبؔ کامل

تاریخی ترتیب سے

مرتبہ

کالی داس گپتا رضاؔ

دیوانِ غالب (کامل)

تاریخی ترتیب سے

کالی داس گپتا رضا

دیوانِ غالب (کامل)

تاریخی ترتیب سے

مرتبہ

❁

کالی داس گپتا رضاؔ

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی ۲۰ ۴۰۰۰۲۰

© کالی داس گپتا رضا

0168, 1L97, 1
M8

Acc. No, 194

بار اول ❁ ۱۵ر فروری ۱۹۸۸ء

تعداد ❁ پانچ سو

قیمت ❁ ۱۶۰ روپے

طباعت ❁ ملٹی پرنٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

پبلشرز ❁ ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ - ۱۰۷ جولی بھون - ۱
۱۰ نیو مرین لائنز - بمبئی - ۴۰۰۰۲۰

شریمتی

ساوتری کالی داس گپتا

کے نام

جس کے ہمہ وقتی تعاون ہی سے
یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا

فہرستِ مضامین

انتساب ______ ۵
فہرستِ مضامین ______ ۶
مقدمہ ______ ۹
کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کیوں ______ ۱۱
تعارف ______ ۲۱
غالب کا اولین اُردو منظوم کلام ______ ۲۶
عمدہ منتخبہ میں ذکرِ غالب ______ ۳۳

غالب کے بعض غیر متداول اُردو اشعار کا زمانۂ فکر ______ ۴۲

غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر ______ ۵۴

دیوانِ غالب - طبع اوّل ______ ۵۹

غالب کی زندگی میں دیوانِ غالب کی اشاعت

(دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعدادِ اشعار) ______ ۶۸

توقیتِ غالب ______ ۸۲

دیوان غالب (کامل) ______ ۹۹

کلام کا پہلا دَور	۱۸۰۷ء	تا	۱۸۱۲ء	۱۰۱
کلام کا دوسرا دَور	۱۸۱۳ء	تا	۱۸۱۶ء	۱۱۱
کلام کا تیسرا دَور	۱۸۱۷ء	تا	۱۸۲۱ء	۲۱۰
کلام کا چوتھا دَور	۱۸۲۲ء	تا	۱۸۲۶ء	۲۴۹
کلام کا پانچواں دَور	۱۸۲۷ء	تا	۱۸۲۸ء	۲۶۸
کلام کا چھٹا دَور	۱۸۲۸ء	تا	۱۸۳۳ء	۲۷۴
کلام کا ساتواں دور	۱۸۳۴ء	تا	۱۸۴۷ء	۲۸۲
کلام کا آٹھواں دور	۱۸۴۸ء	تا	۱۸۵۲ء	۲۸۹
کلام کا نواں دَور	۱۸۵۳ء	تا فروری	۱۸۵۷ء	۳۱۶
کلام کا دسواں دور مئی	۱۸۵۷ء	تا	۱۸۶۲ء	۳۴۵
کلام کا گیارہواں دور	۱۸۶۳ء	تا	۱۸۶۷ء	۳۵۴

اشاریے ———— ۳۶۹

فہرستِ اشعار ———— ۳۷۱

اشخاص ———— ۳۸۴

مقامات کتب و رسائل وغیرہ ———— ۳۹۷

مقدمہ

کلامِ غالبؔ کی تاریخی ترتیب کیوں

نصف صدی پہلے کی بات ہے میں کوئی دس گیارہ سال کا رہا ہوں گا۔ مادری زبان پنجابی ہونے کے باوجود، پنجاب کے کونے کونے میں اردو زبان چھاؤنی چھائے ہوئے تھی۔ ہمارے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ میرے والد محترم اردو کے ادیب تو نہ تھے مگر انگریزی کے گریجویٹ ہوتے ہوئے بھی اردو فارسی کے اس حد تک رسیا تھے کہ انہیں اِن زبانوں کا عالم کہنا کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا۔ مدرسے کے بعد گلستاں، بوستاں اور انوارِ سہیلی کے اسباق میں انھیں سے لیا کرتا تھا۔

ہمارے یہاں ادبی کتابوں میں آبِ حیات (آزاد) اور یادگارِ غالب (حالی) سامنے ہی دھری رہتی تھیں میں نے انھیں نہایت رغبت سے پڑھا، آبِ حیات' پوری اور 'یادگارِ غالب' کا سوانحی حصہ۔ قصّے کہانیاں سمجھ کے ان سے بہت حظ اٹھایا۔ انھیں ایام میں ایک چھوٹی سی کتاب 'یوسف ہندی قیدِ فرنگ میں' نئی نئی آئی تھی۔ چوری چھپے پڑھی۔ مواد ثقیل تھا اور فارسی اشعار بہت تھے۔ کچھ پلّے نہ پڑا۔ گھر میں ہر سال ہمارا خاندانی بھاٹ راجستھان سے آیا کرتا تھا۔ پرانے تاریخی اور فی البدیہہ کبت بہت اچھے کہا کرتا تھا۔ محرّم میں تعزیہ اٹھتا۔ نوحہ خوانی ہوتی۔ بعض نوحے دل کو چھو لیتے۔ ان سب پر مستزاد یہ ادبی کتابیں خاص کر 'آبِ حیات' مجھے شعر کہنے کی چاٹ لگ گئی جس سے آج پچاس سال گزرنے پر بھی سیری نہیں ہوئی۔ ناسخ کیا اچھا کہہ گیا ہے۔ ؎

یہ لگی چاٹ مرے زخموں کو سیری نہ ہوئی
ہو گئے کتنے ہی قاتل کے نمکداں خالی

جنوری ۱۹۷۰ء میں کینیا مشرقی افریقہ سے ہندوستان لوٹا اور بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ شاعری سے والہانہ وابستگی تو تھی ہی، تھوڑا سا رُخ تحقیقِ ادب کی طرف بھی پھر گیا اور یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا۔

اس مشغلے کے لیے ذاتی کتب خانے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک دن کتابوں کی نئی خرید کے ڈھیر میں سے ایک کتاب "یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں" نکل آئی، محسن بن شبیر کی لکھی ہوئی اور ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ میں حیدر آباد کی چھپی ہوئی۔ یہ وہی ایڈیشن تھا جس کا تقریباً پچاس سال پہلے میں نے مطالعہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اب کے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا اور غور کرنے پر معلوم ہوا کہ شاعر کے کسی شعر کو سامنے رکھ کر قصّہ گھڑ لینے کی جو روش ہمارے پرانے تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں نے اختیار کر رکھی تھی وہ آج بھی جاری ہے جیسے کہ محسن بن شبیر لکھتے ہیں (ص ۱۵)

"رفعِ افکار کے لیے ان (غالب) کو بھی تفریحِ طبع کا کچھ سامان کرنا ضرور تھا۔ دو حرفی (مے) کا استعمال بھی وہ غم غلط کرنے کے لیے کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"

یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی سال یا اس سے کچھ پہلے کہا گیا ہوگا۔ اس وقت مرزا پورے شباب پر تھے۔ کیا بلحاظِ عمر اور کیا بہ اعتبارِ شاعری۔ لہٰذا اس شعر سے غم غلط کرنے کا مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ نسخۂ شیرانی میں اس غزل کے دس شعر ہیں، ہر شعر سے رنگِ تغزّل امڈا پڑتا ہے۔ دُور دُور تک آلام و افکار کا پتا نہیں۔ یوں بھی یہ مرزا بیدل کے اس شعر کا ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ؎

مطلبم از مے پرستی تردماغی ہا نہ نبود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

پھر (ص۔۴۰) لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ قرض خواہوں نے نالش کی۔ جوابدہی میں طلب ہوئے مفتی صدرالدین آزردہ کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے، یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن"

آزردہ[1] ۱۵ جون ۱۸۴۶ء کو صدر الصدور مقرر ہوئے تھے۔

اس سے پہلے (شاید ۱۸۲۷ء سے) صدر امین تھے۔ صدر امین کو اب ایمن کہتے ہیں اس کی اپنی عدالت نہیں ہوتی لیکن شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ ۱۸۲۱ء) کے متن میں موجود ہے اس وقت غالب ۲۳۔۲۴ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر بھری عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ شعر کو سامنے رکھ کر قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔

آگے چل کر ص ۵۴ پر حالی کے حوالے سے لکھتے ہیں

"کپڑا اور تمام ضروریات ان کو گھر سے پہنچتی تھیں"

یہاں حالی نے سچ کو چھپایا ہے۔ غالب خود اس بات کی نفی کرتے ہیں ؎

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

---

[1] مفتی صدرالدین آزردہ از پرواز اصلاحی ص ۲۱

یعنی مَیں اس قید سے خوش ہوں کیونکہ اس نے مجھے قیدِ معاش سے بَری کر رکھا ہے۔ اب مجھے روٹی کپڑا داروغہ جیل پہنچاتا ہے۔ یہاں آزاد کو داستاں سرائی کی عادت لے ڈوبی۔ محسن بن شتبیران کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ (ص ۵۴)

"جس دن (غالب) وہاں (قید خانے) سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو کرتا وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہوتا"

اس اقتباس کا پہلا حصّہ بھی درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ جیل خانے کے کپڑے واپس کرنے پڑتے ہیں، پھاڑ کر پھینکے نہیں جا سکتے اور شعر والا حصّہ تو نرا افسانہ ہے کیوں کہ یہ شعر بھی ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا کہا ہوا ہے جبکہ اسیری کا حادثہ مئی ۱۸۴۷ء میں پیش آیا اور جیل سے رہائی غالباً اگست ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ شعر فی البدیہہ نہیں کہا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ موقع محل کو دیکھ کر پڑھ دیا گیا ہو گا۔ مگر شعر موقع محل کے لحاظ سے بھی ایسا با موقع نہیں۔ یہ غزل مرزا کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔ اس کے مقطع کو خواہ مخواہ میں اس واقعہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔

جلسۂ غالب، میں ڈاکٹر سید رغیب حسین رقم طراز ہیں:

"دنیا کا شاید ہی کوئی غم ہو جو غالب کے حصّے میں نہ آیا ہو۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری کا اٹھ جانا، بھائی کی دیوانگی، اولاد سے محرومی، اقتصادی پریشانیوں کا نرغہ، عارف کی ناوقت موت، شریکِ حیات کی مفارقت، دلّی کا اجڑنا، بھائی کا مرنا، مختصر یہ کہ غموں کا ایک ہجوم تھا جس میں غالب تمام عمر گھرے رہے...... انھوں نے خالقِ کائنات سے غموں کا شکوہ کرنے کے بجائے صرف یہ مطالبہ کیا کہ ؎

میری قسمت میں غم، گر، اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

---

(۱) مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۱ء ص ۵

رس ہے کہ عارف کا انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا اور ان کی بیوی کا ان سے تین چار ماہ پہلے، غالب کی بیگم غالب کی وفات کے ایک سال بعد فوت ہوئیں، دتی، ۱۸۵۶ء میں اجڑی، بھائی (مرزا یوسف) ۱۸ اکتوبر، ۱۸۵۷ء کو مرے جبکہ مندرجہ بالا شعر، ۱۸۴۷ء کے کچھ ہی عرصے بعد کا فکر کردہ ہے۔ بتائیے اس کا اطلاق ان واقعات پر کیونکر ہو سکتا ہے۔ یوں بھی اگر اس غزل کے باقی تین شعر (کل چار شعر ہیں) دیکھیے تو ان میں داستانِ غم کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ یہ میر کے اس شعر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور ایسے شعر ہر غزل گو کے یہاں پائے جاتے ہیں:

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

اس ادھوری غزل کا مقطع بھی میر ہی کے یہاں سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میر کہتے ہیں:

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

مرزا نے اسے یوں کر لیا:

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اسی مضمون کا ایک شعر قائم کے یہاں بھی ہے:

بعد خط آنے کے اس کے تھا وفا کا احتمال
لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

حالی نے یادگارِ غالب میں 'لطیفے' کے تحت لکھا ہے

"ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے:

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا، حاشا، یہ شعر میرا نہیں ہے مولوی عبد القادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں، آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں ــــــ"

اس لطیفے سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) گفتگو مولوی عبد القادر رامپوری اور غالب کے مابین ہوئی تھی مگر اس کے راوی کا علم نہیں۔

(۲) مولوی صاحب کو چند روز قلعے سے تعلق رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب سے ملاقات اور گفتگو اُسی زمانے میں ہوئی ہوگی۔

(۳) غالب کا دیوان چھپ چکا تھا جبھی تو مولوی صاحب نے کہا کہ "دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔"

مولوی عبد القادر رامپوری ۱۸۳۸ء میں ضلع مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ اُسی سال ملازمت ترک کر کے دلّی آگئے۔ وہ رامپور میں پیدا ہوئے، رامپور اور مراد آباد میں تعلیم پائی اور ۱۸۰۹ء میں ضلع مراد آباد ہی میں سرکار کمپنی کے ملازم ہوئے۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری[۲]

"... ۱۸۱۴ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی پہنچے اور ۱۸۱۵ء میں واپس آگئے اور ۱۸۱۷ء میں دوبارہ گئے اور ۱۸۱۸ء میں اُنکا تبادلہ اجمیر ہوگیا۔"

---

[۱] مفتی مولوی عبد القادر خاں تخلص غمگین متوفی ۱۸۴۹ء تذکرۂ کاملانِ رامپور ص ۲۳۴

[۲] غالب اور عصرِ غالب۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۸۲ء ص ۱۸۹

اجمیر، راجستھان، جبلپور، ناگپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ملازم رہے۔ اخیر مرادآباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔

حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۴ء میں بعمر ۱۷ سال دلّی آئے تھے۔ ظاہر ہے (۱) کہ حالیؔ نے یہ روایت کسی سے سُنی ہے خود مولوی صاحب نے انھیں نہیں بتائی کیونکہ وہ ۱۸۴۹ء میں فوت ہو چکے تھے۔ شاید شیفتہؔ اس کے راوی ہوں۔ (۲) دلّی آنے کے بعد مولوی صاحب ۶ ماہ شاہ ظفر کے پاس رہے۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری "بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مولوی عبدالقادر تقریباً ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۰ء) میں وکیل مقرر ہوئے"۔ شیفتہؔ اور غالبؔ کے تعلقات تو تھے ہی معلوم ہوتا ہے شاہ ظفر کی ملازمت کے بعد بھی مولوی صاحب چند ے دلّی ہی میں رہے کیوں کہ (۳) غالبؔ کا دیوانِ اردو (پہلا ایڈیشن) ۱۸۴۱ء میں چھپا اور ظاہر ہے یہ بات انھیں دنوں کی ہوگی ورنہ وہ دیوان دیکھنے کی بات کیوں کرتے۔

یہ روایت تذکرۂ کاملانِ رام پور میں بھی درج ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ مرزا غالبؔ "گھر آکر دیوان کو دیکھتے ہیں، پریشان ہو کر ایک ایک سے دریافت کرتے ہیں کہ بھائی یہ شعر (پہلے تو روغن گل....) کہاں ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ نے کہا کہ مولوی صاحب نے آپ کے کلام سے ظرافت کی ہے"

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حالیؔ 'یادگارِ غالبؔ' میں لکھتے ہیں:

"مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو فارسی دیوان میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ اردو میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے "

مگر یہ دونوں شعر تو نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ما مکتوبہ ۱۸۲۱ء کے متن میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ سن وصال کے لحاظ سے ان کا اطلاق ۲۰ سال بعد کے واقعے پر نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ایسے اشعار اور بھی کہے ہیں۔ جیسے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ۔۔۔ سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔۔۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ۱۸۲۱ء

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۔۔۔ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
۱۸۲۱ء نسخۂ حمیدیہ (حاشیہ)
۱۸۲۶ء نسخۂ شیرانی (متن)

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ ۔۔۔ کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

نسخۂ شیرانی ۱۸۲۶ء

مگر یہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں کوئی ۱۸۲۶ء کے بعد کا نہیں۔ اس لیے انھیں ۱۸۴۱ء کے کسی واقعے سے مربوط کر لینا قطعی نادرست ہے۔ ۱۸۲۶ء کا وہ زمانہ ہے جب غالب طرزِ بیدل سے آزاد ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے فارسی میں باقاعدگی سے کہنا شروع کیا مگر چونکہ اس وقت تک وہ بیدل (اور اسیر و شوکت) کی طلسماتی گرفت سے نکل چکے تھے، اس لیے فارسی کلام پر ان کی چیستانی طرز کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ اس عہد کے بعد کا اردو کلام بھی بیشتر اس طرزِ سخن سے پاک ہے۔

جنابِ خورشید الاسلام مکتوبِ غالب بنام علائی سے اقتباس پیش کرتے ہیں[1]۔

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک زمین نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل ؎

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔۔۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے"

---

[1] غالب۔ تقلید اور اجتہاد۔ اشاعتِ سوم ۱۹۷۹ء ص ۲۶

پھر لکھتے ہیں "یہ خط ۱۸۶۲ء کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اور اس وقت غالبؔ کی عمر محض ۱۵ سال یا اس سے بھی کم تھی۔ اس قسم کی نشو و نما کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی پردہ کے رنگ سے خوش یا مطمئن ہو جانے کے بجائے یہ جستجو کرنے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا ہے ......" حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل پہلے پہل ۱۸۲۱ء کے مخطوطے کے حاشیے میں ملتی ہے تب غالبؔ کی عمر ۱۵ سال کی نہیں بلکہ ۲۴ سال سے زیادہ کی تھی۔ ظاہر ہے کہ غزل ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت بھی کہی گئی تھی ۱۸۱۲ء میں نہیں۔

غالبؔ نے شاہ ظفر کی طرف سے ایک مثنوی، شیعت سے برات کے مضمون کی ۱۸۵۳/۵۴ء میں کہی تھی۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ غالبؔ بھی اس کی زد میں آگئے۔ زچ ہو کر سلطان العلماء مولوی سید محمدؔ لکھنوی کو لکھتے ہیں:

"اب وقت آگیا ہے کہ غزل کے پردہ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کروں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ گنجِ ناکامی کے خاک نشیں کے دل میں کیا ہے۔" ۱؎

اب سوال یہ ہے کہ غالبؔ کی، اس غزل سے مراد، کونسی غزل ہے جس میں وہ اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ حاشیے میں مہاجرؔ صاحب ؎ "مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں" کے مقطعے والی غزل کو یہ غزل قرار دیتے ہیں، مگر یہ غزل تو دیوانِ غالبؔ مطبوعہ ۱۸۴۷ء کے متن میں موجود ہے، گویا ۱۸۴۷ء یا اس سے پہلے کہی گئی تھی۔ اسے ۱۸۵۳/۵۴ء کی فکر کردہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کا اشارہ اُس غیر متداول ۲۱ شعری سلام کی طرف ہے، جو ۱۸۵۴ء میں کہا گیا تھا۔ اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو — تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو

مندرجہ بالا چند مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جب تک غالبؔ کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا، ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکر کھاتے رہیں گے۔ میں

۱؎ اقتباس از پنج آہنگ، اردو ترجمہ از مہاجرؔ۔ پاکستان

نے اسی مقصد کو رہنما بنا کر اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب ہی سے غالب کے سوانحی اور فکری ارتقا کا صحیح تجزیہ ہو سکے گا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ غالب کے اردو کلام کے کئی ایک مخطوطے فراہم ہو چکے ہیں جو ان کے مختلف فکری ادوار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور پھر مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کا مرتبہ "دیوانِ غالب" موجود ہے جو کسی نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔

تعارف

غالب کی زندگی میں ان کا مجموعۂ کلام اردو پانچ بار چھپا۔ اس کا نام انھوں نے دیوانِ غالب رکھا۔ پہلے دو ایڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں 'دیوان' کا لفظ موجود ہے، اگرچہ سرورق پر "دیوانِ غالب" کا عنوان طبع نہیں ہوا ہے، البتہ آخری تین ایڈیشنوں کا عنوان "دیوانِ غالب" ہی ہے، جو اُن کے سرورق پر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے:

پہلا ایڈیشن	مطبعِ سید الاخبار، دلی	اکتوبر ۱۸۴۱ء	کل شعر ۱۰۹۶[1]
دوسرا ایڈیشن	مطبعِ دار السلام، دلی	مئی ۱۸۴۷ء	" " ۱۱۵۸[2]
تیسرا ایڈیشن	مطبعِ احمدی، دلی	جولائی ۱۸۶۱ء	" " ۱۷۹۶
چوتھا ایڈیشن	مطبعِ نظامی، کانپور	جون/جولائی ۱۸۶۲ء	" " ۱۸۰۲
پانچواں ایڈیشن	مطبعِ مفیدِ خلائق، آگرہ	۱۸۶۳ء	" " ۱۷۹۵

۱۔ اس بحث کے لیے دیکھیے پیش لفظ دیوانِ غالب (عکسی) [مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء] ۔ ۱۹۸۶ء کالی داس گپتا رضا

۲۔ ..... پیش لفظ دیوانِ غالب چوتھا ایڈیشن [جون جولائی ۱۸۶۲ء (عکسی)] ۱۹۸۰ء کالی داس گپتا رضا

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، چوتھے ایڈیشن یعنی مطبعِ نظامی کے نسخے میں کلام سب ایڈیشنوں سے زیادہ ہے یعنی اس میں ۱۸۰۲ شعر ہیں۔ اس کے برعکس جو نسخہ اِس وقت آپکے مطالعے میں ہے اُس میں ایک آدھ مصرعے کی کمی کے ساتھ ۲۰۹۹ شعر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ چند شعر شامل ہیں جو غالب کے نہیں مگر جن کو غالب نے تضمین کر کے اپنا بنالیا ہے مگر وہ چند شعر اور مصرعے شامل نہیں جو محض غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کا آئینہ ہیں اور کسی ادبی حیثیت سے عاری ہیں۔ تاہم ایسے اشعار کو "غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر" کے عنوان سے مقدمے میں شامل کر لیا گیا ہے تاکہ یہ مواد بھی قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے۔

ضخامت اور تعدادِ اشعار کے پیشِ نظر اسے غالب کے اردو کلام کا کلیات کہنا چاہیے مگر میں نے غالب کے مجموعہ کلام اردو کی روایت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کا نام "دیوانِ غالب" ہی رہنے دیا ہے۔ صرف ایک لفظ "کامل" کا اضافہ کر دیا ہے یعنی "دیوانِ غالب (کامل)"۔ ظاہر ہے کہ اس میں غالب کے متداول ۱۸۰۲ اشعار بھی آ گئے ہیں۔

میں نے مندرجہ ذیل درجۂ اوّل کے ۱۹ ماخذوں کی مدد سے غالب کے کلام اردو کے گیارہ ادوار قائم کئے ہیں جو مع تعدادِ اشعار یہ ہیں۔ اسی جدول میں یہ بھی دکھا دیا گیا ہے کہ ہر دور کے جملہ اشعار میں سے کتنے شعر متداول دیوان کیلئے انتخاب کئے گئے۔ درجۂ دوم کے ماخذ نظر انداز کر دیئے ہیں۔

ادوار	کل اشعار	دیوان کیلئے منتخب اشعار
۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۲ء	۵۹	۴
۱۸۱۳ء تا ۱۸۱۶ء	۱۷۳۴	۳۰۲
۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء	۶۹۵	۳۳۹
۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء	۲۹۸	۲۶۸
۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۸ء	۹۱	۸۶
۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء	۸۹	۷۴

۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء		۸۹	۸۵
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء		۴۴۴	۳۸۴
۱۸۵۳ء تا اپریل ۱۸۵۷ء		۴۴۰	۲۵۴
مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء		۹۵	۶
۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۷ء		۱۷۵	-
	میزان	۴۲۰۹	۱۸۰۲

ماخذوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) تذکرۂ عیارالشعرا (۲) تذکرۂ عمدۂ منتخبہ۔ مطبوعہ (۳) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب۔ تین عکسی اشاعتیں، عرشی زادہ، کمال احمد صدیقی، نقوش لاہور (۴) نسخۂ بھوپال مشمولہ نسخۂ حمیدیہ۔ تین مطبوعہ نسخے مرتبہ مفتی محمد انوارالحق، چوتھا مطبوعہ نسخہ مرتبہ حمید احمد خاں (۵) نسخۂ شیرانی۔ عکسی اشاعت (۶) گلِ رعنا۔ قلمی اور مطبوعہ (۷) نسخۂ رام پور اوّل یا قدیم (۸) انتخابِ غالب (۹) نسخۂ بدایوں (۱۰) دیوانِ غالب پہلا مطبوعہ ایڈیشن (۱۱) نسخۂ دیسنہ (۱۲) نسخۂ کریم الدین یا نسخۂ کراچی (۱۳) دیوانِ غالب دوسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۴) نسخۂ لاہور (۱۵) نسخۂ رام پور ثانی یا جدید (۱۶) قادرنامۂ غالب۔ مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۵ھ، فیضِ محمدی لکھنؤ ۱۸۹۲ء، مصری لال پریس ہاتھرس ۱۸۹۶ء (۱۷) دیوانِ غالب تیسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۸) دیوانِ غالب چوتھا مطبوعہ ایڈیشن (۱۹) دیوانِ غالب پانچواں مطبوعہ ایڈیشن

اِن میں سے مندرجہ ذیل ۸ ماخذ میں نے نہیں دیکھے۔ اس لیے ان کے لیے کلّی طور پر دیوانِ غالب مرتبہ عرشی (اشاعتِ دوم) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ باقی تمام ماخذ میرے

کتب خانے کے غالب کلکشن میں موجود ہیں:

(۱) تذکرہ عیار الشعراء (۲) نسخہ رام پور اوّل یا قدیم (۳) انتخابِ غالب (۴) نسخہ بدایوں (۵) نسخہ دلیسنہ (۶) نسخہ کریم الدین

(۷) نسخہ لاہور (۸) نسخہ رام پور ثانی یا جدید

کلام کے زمانۂ فکر کے تعین کے لیے یہ قاعدہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی ماخذ کی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم تر ماخذ میں پایا گیا ہے تو اس پوری غزل کو قدیم تر ماخذ میں شامل سمجھا گیا ہے کیونکہ پوری غزل نہ کہی گئی ہو تو بھی اُس کی اساس اسی عہد میں رکھی گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اُس غزل کے کچھ اشعار واقعی بعد کے کہے ہوئے ہوں مگر ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔

اِملا اور روایتِ اشعار بیشتر نسخہ عرشی کے مطابق ہیں۔ کہیں کہیں اختلاف بھی روا رکھا گیا ہے۔ خاص کر اوقاف و اعراب لگانے میں معمولی ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ تاہم کلام کے فکر کا عہد وہی ہے جس میں وہ پہلی بار تخلیق ہوا تھا۔

اختلافِ نسخ کو کہیں واضح نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام نسخہ عرشی میں احسن طریقے سے انجام دیا گیا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ کہیں شبہ ہو تو "دیوانِ غالب نسخہ عرشی" سے رجوع کیا جائے۔

بہت سے اشعار کے درمیان یا آگے، اور نظموں، قصیدوں قطعوں وغیرہ کے عنوانات کے نیچے 'م' کا نشان بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی پہچان ہے کہ یہ کلام متداول دیوانِ غالب میں شامل ہے۔ اس نسخے میں حواشی کثرت سے ہیں اور بغیر حوالوں کے دیئے گئے ہیں۔ ان حاشیوں میں اگر کوئی عبارت واوین میں بغیر حوالے کے ہے تو اسے دیوانِ غالب نسخہ عرشی سے اخذ شدہ سمجھا جائے۔

نسخۂ زیرِ نظر میں غالب کا آج تک کا دریافت شدہ پورا اردو شعری کلام تاریخی ترتیب سے درج ہے۔ یعنی سب سے پہلے وہ اشعار دیے گئے ہیں جو سب سے پہلے تخلیق ہوئے

اس کے بعد اس کی تخلیقاتِ مابعد۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر نظم یا غزل کی تاریخِ فکر معلوم ہو سکے اس لیے "تاریخی ترتیب" کو (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) عہد کے لحاظ سے بانٹ دیا گیا ہے۔ اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے مقدمے کے آخر میں ایک باب "توقیتِ غالب" کے عنوان سے بڑھا دیا گیا ہے، تاکہ اشعار کے زمانۂ فکر کے ساتھ اگر کوئی صاحب شاعر کی اُس عہد کی نجی سرگرمیوں کا بھی موازنہ کرنا چاہیں تو انھیں کوئی دقت نہ ہو۔

غالب کے دیوانِ اردو کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا لیکن اسے کم از کم ساڑھے آٹھ سال پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ یہ دیباچے سے ظاہر ہے جو غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو تمام کیا تھا۔ اس کی تقریظ جو دیوان کے آخر میں شامل ہے نواب ضیاالدین احمد خاں نیّر و رخشاں نے ۱۸۳۸ء/۱۸۳۹ء میں لکھی تھی۔ لہٰذا دیباچۂ غالب اور تقریظِ نواب ضیاالدین احمد خاں کے درمیانی پانچ سالہ وقفے میں پہلے ایڈیشن کے لیے ترتیب دیے ہوئے دیوان میں اضافے ہوتے رہے جنھیں بآسانی دیوانِ زیرِ مطالعہ میں اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشنوں میں بھی غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور نواب ضیاالدین احمد خاں کی تقریظ دونوں شامل ہیں صرف چوتھے ایڈیشن مطبعِ نظامی میں تقریظ شامل نہیں۔ اعداد شمار کے علاوہ تقریظ میں معمولی ترمیم ہوئی ہے۔ مگر دیباچۂ غالب میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ قاری کی دلچسپی کے لیے دیباچہ اور تقریظ پر الگ سے ایک باب قائم کر دیا گیا ہے کیونکہ صرف دیباچہ اور تقریظ درج کر دینے سے بات پوری نہیں ہوتی تھی۔

اگرچہ اب غالب کا مرتب کردہ کلامِ اردو (دیوانِ غالب) اس نسخے میں ضم ہو کر کتابی شکل میں اپنی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتا تا وقتے کہ 'م' کے نشان والے کلام کو از سرِ نو یکجا نہ کیا جائے، پھر بھی امید ہے کہ غالب کی زندگی میں شائع شدہ دیوانِ غالب کے ایڈیشنوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں غالب کی زندگی میں دیوان غالب کی اشاعت (دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعدادِ اشعار" والا باب بے حد معاون ثابت ہوگا۔

غالب کا اوّلین اُردو منظوم کلام

۱۸۹۷ء حالی[1] لکھتے ہیں:

"منشی بہاری لال مشتاق[2] کا بیان ہے کہ لالہ کنھیّا لال[3] ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ایک بار دلّی میں آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے تپنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
مے کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس

---

1. یادگارِ غالب، ص ۱۰۷۔ فٹ نوٹ (حالی ۱۸۳۷ء تا یکم جنوری ۱۹۱۵ء)
2. تمیذِ غالب۔ ۱۸۳۵ء تا ستمبر ۱۹۰۸ء
3. یہ شیو نراین آرام (۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء تا ۸ ستمبر ۱۸۹۸ء) شاگردِ غالب کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔

کی تھی۔"

قیاس ہے کہ حالی نے غالب کے انتقال کے بعد، شاید اس زمانے سے جب وہ ۱۸۷۵ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں فارسی اور عربی کے مدرسِ اوّل مقرر ہوئے، "یادگارِ غالب" کا ڈول ڈالا ہوگا اور انھیں ایام میں بہاری لال مشتاق نے یہ واقعہ انھیں بتایا ہوگا۔ مثنوی یا مشتاق کو یاد نہ رہی ہوگی یا حالی بھول گئے ہونگے اور آخری فارسی شعر یاد رہ گیا ہوگا۔

۱۹۳۱ء میں بالآخر ایڈیٹر سہ ماہی "اردو"[1] (اورنگ آباد) کے نوٹ کے ساتھ یہ مثنوی شائع ہوئی جس میں درج ہے کہ "صفدر مرزا پوری مرحوم نے (یہ مثنوی) بھیجی تھی جو کاغذوں میں پڑی رہ گئی اور اب شائع کی جاتی ہے ......" صفدر مرزا پوری مرحوم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اس مثنوی کو "ہمارے محترم بزرگ زاہد (سہارنپوری) مدظلہ نے ہماری جدید تالیف حسنِ خیال[2] کے لیے نقل فرما کر" بھیجا۔ قیاس ہے کہ "حسنِ خیال" ۱۹۳۱ء کے بعد چھپا۔ اس لیے یہ بیان وہیں سے لے کر یہاں درج کیا جاتا ہے:

> مرزا غالب کو بچپن میں پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا۔ اکبر آباد میں ان کی پتنگ بازی کا شہرہ تھا۔ اسی زمانے میں مرزا نے پتنگ کے تلازمے میں کسی کے فارسی شعر مندرجۂ ذیل پر بطورِ ترکیب بند شعر لکھے تھے
>
> شعر:
>
> رشتہ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست
>
> لیکن وہ ترکیب بند کسی نے نقل نہیں کیا۔ نہ غالباً کسی کو ملا۔ حضرت زاہد کے جدِ مرحوم حاجی وزائر سید اکبر علی صاحب بلیغ ابوظفر شاہ آخر دہلی کے معتمد و وکیل تھے اور شاہ کی پنشن کا مقدمہ جو کمپنی سے لڑا اُس

۱ؐ سہ ماہی 'اردو' اورنگ آباد۔ شمارہ جولائی ۱۹۳۱ء ص ۵۱۵

۲ؐ مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو ہسپتال روڈ لاہور (سنہ اشاعت درج نہیں) ص ۱۰۱

میں اوّل سے آخر تک وکیل شاہی کی حیثیت سے اس زمانے میں برابر اکبر آباد میں عدالت العالیہ ہونے کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے۔ خود بھی ذی علم اور اچھے شاعر تھے۔ اُن کی بیاض میں یہ ترکیب بند لکھا ہوا ملا۔ جو دلدادگانِ کلامِ غالب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اگرچہ بچپن کی زبان ہے۔

ترکیب بند

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی ۔۔۔ لیکے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا ۔۔۔ اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دلبراں ۔۔۔ بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار ۔۔۔ یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر اِن کے نظر ۔۔۔ کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی تیری ان سے سانٹھ ۔۔۔ لیکن آخر کو پڑیگی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے ۔۔۔ قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے ۔۔۔ بھول مت اِس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھکو لڑا دیں گے کہیں ۔۔۔ مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب ۔۔۔ غوطے میں جاکر دیا کٹ کر جواب

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

صفدر مرحوم نے زاہد سہارنپوری مرحوم کی ایک مثنوی بھی نقل کی ہے جس میں اسی فارسی شعر کو تضمین کیا ہے:

جب مدینے میں نہ پایا کچھ بھی چین ۔۔۔ گھر کو چھوڑا آئے مکے میں حسین ؑ
وھاں بھی پہنچے گھات میں اہلِ نفاق ۔۔۔ تب کیا قصد آپ نے سوئے عراق
یہ خیال آیا کہ ہو کر قتلِ عام ۔۔۔ ہو نہ ضائع حرمتِ بیت الحرام

الغرض گزرے سفر میں پانچ ماہ | بستیوں میں تھی نہ جنگل میں پناہ
یوں رہے کوہ و بیاباں میں رواں | آج اس منزل پہ ٹھہرے کل وہاں
پوچھتا رستے میں زاہد جب کوئی | ہے کدھر کا قصد اے سبطِ نبی
آپ فرماتے تھے جاتا ہوں اُدھر | حق تعالےٰ کی مشیّت ہے جدھر

"رشتہ' در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست"

صفدر مرحوم کے بیان اور دیوانِ غنیؔ[1] سے معلوم ہوا کہ مُلّا طاہر غنیؔ کشمیری نے بھی اس فارسی بیت کو تضمین کیا ہے:

ہنڈوے دیدم کہ مستِ عشق بود | گفتمش زیں جستجویت چیست سود
در جوابم گفت آں زنّار دار | نیست در دستم عنانِ اختیار

"رشتہ' در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہرجا کہ خاطر خواہِ اوست"

مندرجہ بالا سے دو باتوں کی تحقیق لازم ہوئی اوّل مثنوی کا عہدِ فکر کیا ہے، دوم یہ کہ اس فارسی شعر کا جسے تضمین کیا گیا ہے، خالق کون ہے۔

اوّل حالیؔ، بہاری لال مشتاق شاگردِ غالب کی زبانی روایت بیان کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ مثنوی، غالب نے آٹھ نو سال کی عمر میں کہی تھی۔ صفدر مرزاپوری بتلاتے ہیں کہ یہ کلام مرزا کے بچپن میں پتنگ اڑانے کے زمانے کا ہے اور کہ "بچپن کی زبان ہے"۔ اور مثنوی کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کیے ہی بنتی ہے۔ مرزا ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ اب اگر آٹھ نو سال کو دس سال تسلیم کر لیا جائے تو اس کلام کا زمانۂ فکر ۱۸۰۷ء ہوا۔ گویا غالب کا اوّلین اردو منظوم کلام جو ہم تک پہنچا وہ یہی ہے اور دس سال کی عمر

---

(۱) دیوانِ غنی۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی ...... ۱۹۶۲ء ص ۲۴۸

یعنی ۱۸۰۷ء کا کہا ہوا ہے۔

دوم
رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

حالی (۱۸۹۷ء) اور بہاری لال مشتاق (اس سے بھی کئی برس پہلے) اِسے کسی استاد کا شعر بتاتے ہیں۔ صفدر مرزا پوری مرحوم بھی اسے "کسی کا فارسی شعر" کہتے ہیں۔ غلام رسول مہر[1] اور مولانا عرشی مرحوم بھی شعر کے خالق کے بارے میں خاموش ہیں۔

فرہنگِ آنندراج میں رشتہ کے تحت درج ہے۔

"....و آنکہ درویشاں بر میاں بندند و عیاراں بباِم افگنند۔ چنانچہ گفتہ اند

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

فرہنگِ آنندراج میں یہ حوالہ فرہنگِ انجمن آرائے ناصری سے لیا گیا ہے۔ جو ۱۲۸۸ھ (۷۲-۱۸۷۱ء) میں تالیف ہوئی تھی۔ ان دونوں میں بھی شعر کے خالق کا ذکر نہیں۔

اس شعر کا قدیم ترین اندراج جو ابھی تک ہماری نظر سے گزرا ہے وہ یہی غنی کشمیری کے کلام میں ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ غنی کشمیری کا انتقال ۱۶۶۹ء میں ہوا تھا۔[3]

چند روز ہوئے جنابِ مشفق خواجہ (کراچی پاکستان) نے از راہِ کرم "ن۔م۔ راشد۔ ایک مطالعہ" مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی بھجوائی۔ اس کے ص ۲۸۸ پر ن۔م۔ راشد مرحوم نے اپنے خط بنام ڈاکٹر جمیل جالبی مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء میں لکھا ہے

---

1. 'غالب' از مہر۔ چوتھا ایڈیشن مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۵۰۴ حاشیہ
2. جلد دوم ص ۱۹۶ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء۔
3. پارسی سرایان، کشمیر ص ۳۶، تذکرہ شمع انجمن ص ۳۴۸

"در گلویم[1] رشتۂ اے افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست
یہ رومی کا شعر ہے۔ آج کل نئے سرے سے مثنوی (مولوی معنوی)
پڑھ رہا ہوں....."

چلیے، یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ تاہم میں نے اپنی تسلی کے لیے مثنوی مولوی معنوی دیکھی اور اس کے چھیوں دفتر راتوں رات چھان مارے مگر یہ شعر کہیں نہ ملا۔ اس قسم کے قوافی تو بہت سے ملے مگر یہ شعر عنقا کی طرح غائب۔ یہ بات قطعی ہے کہ یہ شعر مثنویِ مولانائے روم ہی کے وزن میں ہے اور اس کے اسلوب سے بھی مثنویت جھلکتی ہے۔ اور غنی کشمیری کے کلام سے واضح ہے کہ شعر ساڑھے تین سو سال پرانا ضرور ہے[2]۔ تاہم یہ شعر مثنوی مولوی معنوی میں نہیں ہے تو پھر یہ شعر کس کا ہے؟

مولانا غلام رسول مہر[3] نے اس مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے یادگارِ غالب[4] (ص ۹۷) کا حوالہ دیا ہے اور پوری مثنوی درج کی ہے جبکہ یادگارِ غالب میں صرف وہ فارسی شعر درج ہے جو مثنوی میں تضمین کیا گیا ہے، مثنوی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر مرحوم نے یہ مثنوی یا رسالہ سہ ماہی اردو اورنگ آباد (جولائی ۱۹۳۱ء ص ۵۱۵) سے لی ہے یا پھر 'حسنِ خیال' (ص ۱۰۷) سے، مگر حوالہ یادگارِ غالب کا دے دیا ہے۔ اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

1۔ حالی نے مصرعِ ثانی میں می برد کی جگہ می کشند لکھا ہے۔ فرہنگِ آنند راج (انجمن آرائے ناصری) میں بھی می کشند ہی ہے۔ مگر صفدر مرزاپوری مرحوم نے تینوں جگہ می برد لکھا ہے۔ راشد صاحب کا لکھا ہوا "در گلویم رشتۂ اے..." کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

2۔ رومی کا انتقال ۱۷/۱۲/۱۲۷۳ء میں ہونا تسلیم کیا جاتا ہے۔

3۔ 'غالب' طبعِ چہارم۔ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۴۹/۵۰-۴۸ حاشیہ

4۔ نہ جانے یہ یادگارِ غالب کے کون سے ایڈیشن کا حوالہ ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اسے ص ۱۰۷ پر دیکھا جا سکتا ہے

"ایک صاحب حاجی سیّد اکبر بلیغ سہارنپوری تھے ...... انھوں نے ایک بیاض یادگار چھوڑی تھی جس میں یہ مثنوی بھی مرقوم تھی۔ میں اسے تبرکاً یہاں نقل کرتا ہوں ——————"

یہ عبارت تاثر دیتی ہے کہ وہ بیاض جس میں یہ مثنوی مرقوم تھی، مہر مرحوم نے دیکھی تھی اور مثنوی وہاں سے لے کر انھوں نے درجِ کتاب کی ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ رسالہ اردو، حسنِ خیال اور غالب از مہر کی تحریروں سے بخوبی روشن ہے کہ مثنوی اور اس کے دستیاب ہونے کے کوائف مہر مرحوم نے رسالہ اردو یا حسنِ خیال سے نقل کیے ہیں نہ کہ اصل بیاض سے۔ اس کے علاوہ مہر مرحوم نے مندرجہ ذیل تصرفات بھی کیے ہیں جو بغیر حوالے کے ہیں:

رسالہ اردو	حسنِ خیال	غالب از مہر
بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں
گو رہے بیٹھے پہ نہ کر ان کے نظر	...... ایضاً	...... نہ ان کے کر نظر
اب تو ملجائیگی ان سے تیری سانٹھ	...... تیری ان سے سانٹھ	...... ان سے تیری سانٹھ
ایک دن تجھکو لڑا دیں گے کہیں	...... ایضاً	...... لڑا دیں گے کہیں

جنابِ عرشی مرحوم نے، مہر مرحوم کی پیروی کرتے ہوئے "بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں" کی جگہ "بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں" لکھا ہے۔ میرے خیال میں چونکہ زاہد سہارنپوری مرحوم نے مثنوی اصل بیاض سے نقل کر کے صفدر مرزاپوری کو بھیجی تھی جو سب سے آخر میں صفدر مرزاپوری کی زیرِ نگرانی ان کی مؤلفہ کتاب "حسنِ خیال" میں چھپی، اس لیے تمام متنوں پر "حسنِ خیال" ہی کے متن کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں نے دیوانِ غالب (کامل) میں اسی متن کو جائز رکھا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دونوں متنوں میں سے اچھا کون سا لگتا ہے تو اس کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ مثنوی بچپن میں کہی گئی تھی اس لیے اس میں کھوٹا کھرا چھانٹنا عبث ہے۔

عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالبؔ

تذکرۂ شعرا موسوم بہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ، غالبؔ کی ابتدائی شاعری کا عہد متعین کرنے کے لیے اہم ترین ماخذ ہے خصوصاً نسخۂ مملوکہ قومی عجائب گھر، کراچی۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰-۰۱ء تا ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱-۳۲ء ہے جس میں متن کے علاوہ حاشیوں پر اضافے بھی شامل ہیں۔[۱] متن میں غالبؔ کا ترجمہ اسدؔ کے تحت ہے اور وہ یہ ہے

اسدؔ تخلص، میرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد۔ جوانِ قابل و یار باش، ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر متمکن۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ موزوں گشتہ۔ زورِ بیہ خیال بندی بیش از بیش بہ نہادِ خاطر دارد۔ از نتائجِ طبعِ اوست

۱۔ شمشیرِ صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہو کہ بہ رخسار سادہ ہو

۲۔ دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے "جائزہ مخطوطاتِ اردو" جلد اول، ص ۵۰۴ تا ۵۰۸، از مشفق خواجہ مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء مرکزی اردو بورڈ لاہور۔

۳- آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعلِ بیش بہا، کاروانِ اشک

۴- آنسو کہوں کہ، آہ، سوارِ ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

۵- ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

۶- دیکھے وہ برقِ تبسم بس کہ دل بے تاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوارۂ سیماب ہے

۷- کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

۸- مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

۹- ہووے ہے جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں

۱۰- سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا، جاتا ہوں

اس نسخے کی کتابت کی تکمیل ۲۶ رمضان ۱۲۳۵ھ مطابق، جولائی ۱۸۲۰ء کو ہوئی، گویا اس سے پہلے غالب کا ترجمہ لکھا جا چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ترجمہ تحریر ہوا تھا اس وقت تک سرور غالب سے ذاتی طور پر واقف نہ تھے گویا غالب دلی میں ابھی نئے ہونگے۔ وہ ۱۸۱۲ء میں آگرہ سے دلی آ کر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ سال دو سال اِدھر اُدھر علمی ادبی حلقوں میں جان پہچان میں لگ گئے ہونگے۔ اور اس طرح شاید ۱۸۱۴ء کے آخر میں اس نسخے کی زینت بنے ہونگے۔ چنانچہ اوپر کے ان دس اشعار کو ۱۸۱۲ء تک کے فکر کردہ اشعار کہا جا سکتا ہے جبکہ غالب

کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

یہ دس اشعار سات غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ پانچ غزلوں سے ایک ایک شعر، ایک غزل سے دو شعر اور ایک غزل سے تین شعر۔ پانچ غزلوں میں سے، جن کا صرف ایک ایک شعر ہم تک عمدہ منتخبہ کے ذریعے سے پہنچا تھا، دو غزلیں مکمل دستیاب ہو گئی ہیں۔ دونوں غزلیں نسخۂ بھوپال ۱ (نخبۂ غالب) ۱۸۱۶ء، نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ۱۸۲۱ء اور نسخۂ شیرانی ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے کچھ اشعار بعد میں فکر کیے گئے ہوں تاہم ان کی اساس ۱۸۱۲ء تک پڑ چکی تھی اس لیے غزلوں کی تخلیق کا عہد یہی مانا جائے گا۔ ترمیم و تنسیخ کا عمل فن کار کے یہاں عمر بھر جاری رہ سکتا ہے۔ دونوں غزلوں کے باقی ماندہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ایک غزل کے مقطع میں غالب تخلص آیا ہے۔ تب تخلص اسد ہی تھا۔ غالب تخلص کا استعمال ۱۸۱۶ء میں شروع ہوا۔

ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا　　طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ، زبانِ اشک
میں وادیِ طلب میں ہوا جملہ تن عرق　　از بسکہ صرفِ قطرہ زنی تھا لسانِ اشک
رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایکبار　　مژگاں کو دوں فشار، پئے امتحانِ اشک
دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار　　باغ بخوں تپیدن و آبِ روانِ اشک
سیل بنائے ہستیِ شبنم ہے آفتاب　　چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل، نشانِ اشک
ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں، اسدؔ　　ہے بر سرِ مژہ نگراں، دیدبانِ اشک

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا　　گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل　　ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
مَیں اور صد ہزار نوائے جگر خراش　　تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ　　ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں
اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدعا رسا　　اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں
مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا مگر اُسے　　اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

دز دیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

طرزِ آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں

غالبؔ ہے رتبۂ فہم تصوّر سے کچھ پرے ہے عجز بندگی کہ علی کو خدا کہوں

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ۷ جولائی ۱۸۲۰ء کے بعد تذکرے کے حاشیوں میں کثرت سے اضافے کیے گئے اور یہ عمل ۳۲-۱۸۳۱ء تک جاری رہا۔ اس طرح غالبؔ کے ترجمے اور اشعار دونوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف غالبؔ کی شہرت ہی نہیں تھی بلکہ سرورؔ کی ان سے ذاتی شناسائی بھی تھی۔ ترجمے میں یہ اضافہ ہوا

تخلّص کے بعد: "اسد اللہ خاں عرف"

"یار باش" کے بعد: "و درد مند"

"متمکن" کے بعد: "خوکردۂ غم ہائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز، در فنِ سخن سنجی متتبع محاوراتِ میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند بالجملہ موجد طرزِ خود ست و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد"

اشعار میں ۲۳ شعر اور ایک رباعی کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ ہیں ؎

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسباب ہوس بہتر جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط کی تصوّر نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبطِ دگر ہے آج قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ　　خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل　　دردِ جدائی اسداللہ خاں نہ پوچھ

اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

غزل کے ۱۲ مزید شعر

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کب سنتے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

تا اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

۲۳ دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہوں ملول اس کو سن کر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

اِن ۱۲۳ اشعار اور ایک رباعی میں ۴ اشعار ایسے ہیں جو سوائے "عمدۂ منتخبہ" کے کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں نہیں پائے جاتے۔ وہ ہیں شعر نمبر (۱) اک گرم آہ کی۔۔۔۔ (۲) پروانے کا نہ غم۔۔۔۔ (۵) نیازِ عشق خرمن سوز۔۔۔۔ (۶) یاد آیا جو وہ کہنا۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ غزلیں ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) مرتب کرتے ہوئے غالب نے خارج کر دیں۔ لہٰذا ان کا زمانۂ فکر بھی ۱۸۱۲ء کے آس پاس ہو گا۔

شعر ۳-۴-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) کے متن میں موجود ہیں اس لیے ان کا زمانۂ فکر زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء قرار پایا۔ ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا، اس غزل کے چار شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) (۱۸۲۱ء) کے حاشیے پر اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہیں۔ اس لیے بیش از بیش ۱۸۲۶ء کی کہی ہوئی ہے۔ ع پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے، اس غزل کے تمام شعر (۱۴) نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں درج ہیں۔ زمانۂ فکر بھی اسی سال کو سمجھ لیجیے۔ ع کب سنے ہے وہ کہانی میری،

یہ مصرع جو لعد میں ”کب وہ سنتا ہے کہانی میری“ میں تبدیل ہو گیا، ایک ایسی غزل سے ہے جو نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کی پچھلی ریکھا کو پار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کل شعر ۹ ہیں جن میں سے ۳ عمدۂ منتخبہ میں لیے گئے۔ یہ غزل متن میں نہیں حاشیے پر ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ بھی ۱۸۲۶ء میں کہی گئی ہوگی کیونکہ میری دانست میں عمدۂ منتخبہ میں غالب کے ترجمے کے حواشی اور اشعار کے اضافے نومبر ۱۸۲۶ء تک مکمل ہو چکے تھے۔ گو اس بات کا امکان ہے کہ تذکرے کے اوراق مزید شاعروں کے تراجم کے اندراج کے لیے چندے اور بھی کھلے رکھے گئے ہوں۔ ۱۸۲۶ء میں غالب کو دلّی آئے اور مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے ۱۴ برس ہو گئے تھے۔ اس مدّت میں سرور مولف تذکرہ سے (جیسا کہ ترجمے میں بعد کے اضافے سے ثابت ہے) ”رابطۂ یکجہتی“ بھی مستحکم ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ دسمبر ۱۸۲۶ء میں جب غالب کلکتہ کے دور دراز سفر پر روانہ ہوئے تو وہ اپنے ترجمے میں کوئی کور کسر چھوڑ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب (۱۸۲۶ء کے بعد) دوسرے شاعر اپنا کلام انھیں دیتے تھے تا کہ وہ اپنے دوست نواب سرور سے سفارش کر کے ان کا کلام داخل تذکرہ کرا دیں۔ اور یہ بات غالب کے خط بنام شیفتہ (مطبوعہ پنج آہنگ) سے ظاہر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ قیامِ کلکتہ کے دوران مرزا احمد بیگ خاں تپاں نے انھیں اپنا کلام دیا تھا تا کہ جب وہ دلّی لوٹیں اور اعظم الدولہ (نواب سرور مولف تذکرہ) ان سے ملنے آئیں تو انھیں وہ تپاں کا کلام تذکرے میں درج کرنے کے لیے دیں۔ ایسی حالت میں، اور غالب کے مزاج کو جانتے ہوئے، یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت (۱۸۲۶ء) تک تذکرہ سرور یعنی عمدۂ منتخبہ میں ان کا ترجمہ کسی طرح بھی ادھورا رہا ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخری تین غزلیں (زمانہ تکر تقریباً ۱۸۲۶ء) سے

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کی بہترین غزلوں میں سے ہیں اور یقیناً خود غالب کی فراہم کردہ ہیں۔

عمدۂ منتخبہ کے تعلق سے یہاں تذکرۂ عیار الشعراء کا کچھ حال بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے شروع ہوا اور ایک سال بعد تک اس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء تا ۱۲۴۸ھ / ۳۳-۱۸۳۲ء تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا ذکر عمدۂ منتخبہ کے بعد اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس میں غالب کا ترجمہ اسد کے تحت نہیں بلکہ غالب کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ترجمۂ غالب ۱۸۱۶ء یا اس کے بعد داخل کیا گیا۔ کیونکہ غالب تخلص ۱۸۱۶ء ہی سے استعمال میں آیا۔ ترجمے کے شروع کے الفاظ یہ ہیں۔ "مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب....." کل شعر دس ہیں جن میں دو شعر ایسے ہیں جو اور کہیں نہیں پائے جاتے حتیٰ کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) میں بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر غالب کی کسی ابتدائی بیاض کے ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالب میں جگہ نہ پا سکے اور خارج کر دیے گئے۔ لہٰذا انھیں بھی ۱۸۱۲ء ہی کا فکر کردہ کہنا چاہیے۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

صبا، لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

ایک ثقہ راوی کے مطابق کسی تذکرے میں لکھا ہے کہ خوب چند ذکاؔ مولف تذکرۂ عیار الشعراء، نواب سرور مولف تذکرۂ عمدۂ منتخبہ کے یہاں منشی گیری پر ملازم تھا۔ اور جو کچھ وہ عمدۂ منتخبہ میں درج کرتا تھا وہی گھر جا کر اپنے تذکرے عیار الشعراء میں شامل کر لیا کرتا تھا لیکن باوجود تلاش کے میری نظر سے یہ تذکرہ نہیں گزرا۔ بہرحال ایسا لکھا بھی ہو تو یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ

(۱) تذکرہ عیار الشعراء کی بنیاد عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے پڑ چکی تھی

(ب) دونوں کے یہاں ترجمۂ اسد (غالب) میں بہت فرق ہے اور دونوں ترجموں میں تعدادِ اشعار اور اشعار بھی ایک سے نہیں

(ج) صاحبِ تذکرہ عمدۂ منتخبہ نے اپنے یہاں ذکاؔ کا ترجمہ دیا ہے اور لکھا ہے "..... جوانے سلیم الطبع، مزاجش بہ صلاحیت راغب، کلامش نمکین...... مشار الیہ ہم تذکرۃ الشعرا تالیف کردہ۔ در علم اخلاص و دوستی راسخ دریافت گردیدہ۔۔

.... (۵۷ شعر)"

یعنی خود صاحبِ تذکرہ (نواب سرور) ذکا کے تذکرے کا ذکر کرتے ہیں اور ذکا کو بہ تحقیق مخلص اور دوست جانتے ہیں اور کہیں اشارۃً تک نہیں کرتے کہ ذکا ان کے پاس ملازم تھا۔

●

غالب کے بعض غیر متداول اُردو اشعار کا زمانۂ فکر

جناب امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے دیوان غالب کچھ اس طرح مدوّن کیا ہے کہ اب اس کے مطالعے سے غالب کے کلام کا عہدِ تخلیق بھی ماخذوں کی تفصیلی نشاندہی کے سبب سے ایک حد تک متعیّن کیا جا سکتا ہے۔ تاہم بعض اشعار ایسے ہیں جن کا عہد معلوم نہیں ہو سکا میں نے ذیل میں ایسے ہی اشعار کا زمانۂ فکر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ روایتیں بیشتر وہی ہیں جو نسخۂ عرشی میں بیان ہوئی ہیں مگر کوشش کی گئی ہے کہ اصل ماخذوں کو بنظرِ خود دیکھ لیا جائے اور اگر ہو سکے تو اپنے کتب خانے سے ان کو مزید تقویت پہنچائی جائے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس کے بعد نتائج کے لیے میں نے ماخذوں اور اپنے فہم ہی پر بھروسا کیا ہے۔ پہلے غالب کے اشعار درج کیے گئے ہیں اور بعد میں اشعار کے زمانۂ فکر کے تعیّن کی کوشش میں اپنے معروضات۔

(۱) خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا

یہ شعر مکتوباتِ امیر مینائی مرتبۂ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب صفحہ ۱۱ کے حاشیے سے ماخوذ ہے۔ ثاقب نے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے بارے میں متن میں لکھا ہے "نواب ناظم کا پہلا دیوان جو عرصہ ہوا چھپا تھا اور اب کمیاب ہے، مرزا غالب کا دیکھا ہوا ہے"۔ لکھا ہے "خاکسار کو جولائی ۱۹۰۸ء میں خوابیدگانِ تربت گاہِ

---

*ان کی رو سے قطعہ ہے۔

فرخندہ جہانِ بے مثالی ممدوحِ ادانی و اعالی
پیرایۂ صدق و مایۂ فضل شمس العلماء جناب حالی

کا اشتیاقِ زیارت پانی پت لے گیا۔ میں ایک روز یہ مسودہ اُن کو سُنا رہا تھا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو مولانا نے فرمایا کہ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ فرماتے تھے کہ ایک دن مرزا غالب نے مجھے یہ مطلع سُنایا۔ میں نے بہت تعریف کی، تو فرمایا کہ بھیّا! میں تو یہ شعر ناظم کو دے چکا، مطلع نوشی جینے کی الخ"۔ اس سے قطع نظر کہ یہ شعر دیوانِ ناظم (نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور) میں شامل نہیں، یہ کوئی ایسی تحقیق نہیں جس پر شیفتہ یا غالب سر دُھنتے۔ نواب رام پور (ناظم) ۱۸۶۵ء میں فوت ہوئے۔ اس لیے شعر یقیناً اُس کے پہلے کا ہے۔

دیوانِ ناظم مطبوعہ ۱۲۸۰ھ ص ۲۱۹ پر سلام کے مقطع کا پہلا مصرع دیکھیے ؎

"ہم کیا ہیں ناظم اور ہمارا سلام کیا"

شعر سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن اس مصرع کا اسلوب وہی ہے جو شعر کے مصرع ثانی کا ہے۔

(۲) دو رنگیاں یہ زمانے کی، جیتے جی ہیں سب
کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

(۳) پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
روزن کی طرح دیدہ کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر
آیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا[۱]

یہ شعر نواب علاؤالدین احمد خاں علائی (ولادت ۱۸۳۳ء) والیِ لوہارو کی بیاض سے لیے گئے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ کلام ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد کا ہے۔ یہ مرزا کی پریشانی

---

[۱] دیوانِ غالب صدی ایڈیشن۔ مرتبہ مالک رام ص ۳۲۶

اور علالت کا زمانہ تھا۔ لہٰذا اس کا زیادہ امکان ہے کہ شعر کہہ کر چھوڑ دیے ہوں اور پوری غزلیں نہ کہی جا سکی ہوں اگرچہ شعروں کے قافیے اور ردیفیں ظاہر کرتے ہیں کہ غزلیں التزام سے کہنے کا ارادہ رہا ہوگا۔ اشعار کا مفہوم بھی یہی کہہ رہا ہے کہ بڑھاپے میں فکر کیے گئے ہیں۔ پہلے شعر میں جیتے اور مردوں کے آخری حروف بری طرح دبتے ہیں۔ ایسے ناپختہ کلام کو غالبؔ سے منسوب کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ پہلا مصرعہ یوں ہو اور لکھنے میں سہو ہو گیا ہو ؎

دو رنگیاں زمانے کی سب ہیں بجیتے جی

تو بھی مُردوں میں وں کا دبنا بہت کھٹکتا ہے۔ دوسرے دونوں شعر صاف ہیں۔ میں انھیں قیاساً ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد کے کہے ہوئے قرار دیتا ہوں۔

(۴)

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قتل
بجھے ہیں جوگ مایا اور دیبی
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر ہاں، نام کو اورنگ زیبی

دیبی سے مراد کالی دیوی ہے۔ جس کی پوجا ہزاروں برسوں سے ہو رہی ہے۔ دِلّی میں اس دیوی کا مندر ۹ میل دور تغلق آباد کی طرف ہے۔ جوگ مایا کا مندر مہرولی میں ہے جہاں ہفتہ وار میلہ لگتا ہے۔ مہرولی ہی میں سادن میں پھول والوں کی سیر کے نام سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر میلا لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے۔ ظاہر ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب مغلیہ سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا تو اس میلے کو شاہی سرپرستی حاصل نہ رہی۔ اس لیے یہ میلا اس جوش سے جاری نہ رہا مگر اسے ہندوؤں نے سہارا دیا اور خواجہ صاحب کے مزار کے ساتھ انھوں نے اپنی توجہ جوگ مایا کے مندر کی طرف مبذول کر لی چنانچہ سید احمد دہلوی (پھول والوں کی سیر، فرہنگِ آصفیہ جلد اوّل) لکھتے ہیں "غدر کے بعد سے اس میلے نے اور بھی ترقی کی یعنی خاصانِ ہنود کی طرف سے بدھ کے روز جوگ مایا پر ایسے ہی دھوم دھڑکے سے پنکھا چڑھنا شروع ہو گیا۔ سات سات اور نو نو پنکھے آگے پیچھے ہوتے ہیں ......" یہ قطعہ اسی

عہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے اس کا زمانۂ فکر ۱۸۵۹ء کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں
بزمِ شادی ہے فلک، کاہ کشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

یہ شعر مولانا مہر نے اُس قلمی نسخۂ دیوانِ غالب سے نقل کیے ہیں، جو بیگم مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی کی ملکیت میں تھا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے بیاضِ علائی میں بھی انھیں دیکھا ہے۔ بظاہر یہ اس پورے سہرے کے دو شعر ہیں، جو مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب شاگرد غالب (۱۸۴۰ء تا ۱۸۶۹ء) کی شادی پر کہا گیا۔ ثاقب کے سب سے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے شادی مارچ ۱۸۶۱ء یا اس سے پہلے ہوئی ہوگی۔ شادی نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکا کی نواسی سکندر جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔

(۶) اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پَر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ "او گمنام! آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

کہا: "میں صید ہوں اُس کا کہ جسکے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے
اُسی کے زُلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھکو
نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے"
بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر، ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

ایک[2] اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا "آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب"
بال و پر دو چار دکھلا کر، کہا صیّاد نے
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

[1] یہ قطعہ رسالہ مخزن اپریل ۱۹۰۷ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:
"تھوڑے دن ہوئے میجر سیّد حسن صاحب بلگرامی سے تذکرہ شعرا ہو رہا تھا۔ جس میں انھوں نے غالب کا ایک قطعہ سنایا۔ قطعے کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ان کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ اُن کے والد مرحوم سے اُن کو پہنچا اور اب تک غالب کے کسی کلام میں شائع نہیں ہوا، اس کی خوبی زیادہ کر دی۔ میں نے اُسے اُن سے لکھ لیا اور اُن کی اجازت سے مخزن کو بھیجتا ہوں۔ — شیدا، اذ کیمبرج —"
مولانا نظامی بدایونی مرحوم نے اپنی شرحِ دیوانِ غالب ص ۲۸۱ میں اس قطعے اور قطعہ نمبر ۲ کے متعلق لکھا ہے کہ سب سے پہلے ان قطعات کا اضافہ طبعِ سوم میں اس ریمارک کے ساتھ ہوا تھا کہ بعض نقّادانِ سخن ان قطعات کے طرزِ بیان کو حضرتِ غالب کے رنگ سے جداگانہ

سمجھتے ہیں۔ اس پر طبع سوم کے ناظرین میں سے بعض اہل الرائے حضرات نے شکایت کی کہ ان قطعات کو دیوانِ غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ ہم نے نواب عماد الملک (میجر سید حسن بلگرامی کے بھائی) سے ان کے متعلق دریافت کیا۔ وہ فرمانے لگے کہ وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بزرگ سے سنے تھے جو ان کو غالب سے منسوب کرتے تھے، ممکن ہے کہ یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو۔

یعنی (۱) شیلا نے ان اشعار کو میجر سید حسن بلگرامی سے لیا اور سید حسن صاحب کو یہ ان کے والد صاحب سے پہنچے اور (۲) نظامی بدایونی صاحب کے دریافت کرنے پر سید حسن صاحب کے بھائی نے تصدیق کی کہ انھوں نے اپنے ایک بزرگ سے (اپنے والد مرحوم سے نہیں) سنا تھا۔ اور اس لیے وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ "ممکن ہے کہ یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ یہ روایت خاصی ضعیف ہے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ بیانیہ قطعہ (اور اس کے بعد کا صدائے عندلیب' والا قطعہ بھی) غالب کے ہم عمروں، ذوق و مومن کے ان بیانیہ قطعوں کے سامنے کم مایہ ہے جنھیں ہم غالب کی عظمت سے مرعوب ہو کر کوئی مقام دینے سے جھجکتے ہیں۔ دونوں کے یہاں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ذوق

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر ۔ کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب، ڈال رکھا تھا اک اندھیر ۔ مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
کہا جی نے مجھے، یہ ہجر کی رات ۔ یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے ۔ اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا ! ۔ تری آواز مکے اور مدینے

مومنؔ

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے
کہتے تھے مومنؔ اور بہت دیندار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں
جو تھا سو اس کو دیکھ کے زار و نزار تھا
بیمار کر دیا شبِ ہجرِ بتاں نے آہ
کیا ہو گئے وہ روزہ کہ پرہیزگار تھا
یا تو ہمیں ڈراتے تھے خورشیدِ حسن سے
یا اپنے سر پہ داغِ جنوں شعلہ بار تھا
اختر شماریِ شبِ غم نے بھلا دیا
جتنا خیالِ پرسشِ روزِ شمار تھا

(وغیرہ وغیرہ)

اگرچہ غالبؔ بیشتر غزل ہی کے شاعر تھے، تاہم انھوں نے قصیدے اور مثنوی میں بھی کم و بیش اپنے قائم کردہ معیار کو قائم رکھا ہے۔ ایسے قطعات سے

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر

—

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی

—

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

—

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ

میں بھی انھوں نے اپنی طبیعت کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ سیّد حسن بلگرامی صاحب کے فراہم کردہ قطعات اسی عہد کی پیداوار ہیں جس عہد میں غالبؔ نے "ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی" والا کلام تخلیق کیا تھا۔ یعنی ۱۸۰۷ء اور زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۰ء۔

(۷) جو حدِ تقویٰ ادا نہ ہووے تو اپنا مذہب یہی ہے غالبؔ
ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجے تو خوب کیجے

رضا لائبریری رام پور کے نسخہ تذکرہ گلزارِ سخن مولفہ جگن ناتھ نیقص کے، جو ۱۹۰۸ء میں نولکشور پریس میں طبع ہوا ہے، صفحہ ۲۹۷ پر غالب کا تذکرہ ہے۔ اس صفحے کے زیریں حاشیے میں کسی چُنی لال عاصی نے مطالعہ کرتے وقت غالب کے تحت یہ شعر لکھا ہے۔
یہ شعر غالب کے اس مشہور شعر کی پہلی روایت معلوم ہوتی ہے ؂

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ؛ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اگر اس نتیجے کو صحیح مان لیا جائے تو یہ شعر "جو حدِ تقوئی"... الخ ۱۸۲۱ء سے پہلے کی تخلیق قرار پائے گا۔ کیونکہ "ناکردہ گناہوں" الخ والا شعر نسخہ بھوپال مکتوبہ ۱۸۲۱ء میں موجود ہے۔

(۸)

آپ نے "مَسّنِیَ الضُّر" کہا ہے تو سہی
یہ بھی، یا حضرتِ ایوب گلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیونکر؟
ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے، پر اُس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالب
شہرۂ تیزیٔ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

یہ غزل مولانا مہر نے "غالب" ص ۱۳۰ (طبع اوّل) میں دیوانِ غالب کے مخطوطہ بیگم تاباں (حاشیہ ص ۱۰۷) سے نقل کی ہے۔ نیز یہ رسالہ 'آجکل' دہلی بابت ۱۵ جون ۱۹۴۳ء میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

بقولِ مولانا مہر مرحوم، غزل، مخطوطہ بیگم تاباں کے حاشیے پر درج تھی اور مخطوطہ بیگم تاباں "بہ ظاہر رام پور والے قلمی نسخے کی نقل معلوم ہوتا تھا" نسخۂ رام پور ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا تھا، لہٰذا مخطوطہ بیگم تاباں اس کے بعد کتابت ہوا اور یہ غزل اس کے بھی بعد

حاشیے میں اضافہ کی گئی۔ ارمغانِ غالب میں اِسے ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء کی تصنیف کہا گیا ہے۔ مقطع سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غزل ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کہی گئی ہوگی۔

(۹)

بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو، جب اِدبار آتا ہے ۔۔۔ تو یوسف سا حسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے

یہ شعر مولوی احتشام الدّین صاحب دہلوی کے مضمون (ماہِ نو فروری ۱۹۵۶ء) سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مطلع انھیں ایک صاحب وجیہہ الدّین خاں کی مملوکہ بیاض میں ملا تھا۔ اِس بیاض میں مرزا صاحب کی غزل "کہا ہے تو سہی، رہا ہے تو سہی" بھی درج تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس کے ساتھ کوئی دوسرا شعر نہیں ہے۔ وجیہہ الدّین خاں نے غزلِ مذکور کے ہاتھ آنے کی حکایت یہ بیان کی ہے کہ ان کے والدِ ماجد مرحوم نے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے کلام کی اپنی بیاض میں لکھنے کے لیے استدعا کی، مرزا نے فرمایا کہ یہ غزل دیوان میں طبع ہونے سے رہ گئی ہے، تم لے جاؤ۔ غالباً اُسی کے ساتھ یہ مطلع بھی عنایت ہوا ہوگا کیونکہ اس بیاض میں غالب کے نام سے درج ہے، کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں پایا جاتا۔"

میں نے "کہا ہے تو سہی" والی غزل کو بعد از ۱۸۵۷ء قیاس کیا ہے۔ لہٰذا غالب کے عنایت کردہ ایک ہی بیاض میں لکھے ہوئے اشعار کو اُسی عہد میں شمار کرنا چاہیے۔ مگر میرا خیال ہے کہ غالب کم از کم اس بڑھاپے میں یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد تو "سرِ بازار برائے فروخت آتا ہے" یا "سرِ بازار بکنے کے لیے آتا ہے"، کو "بکنے سرِ بازار آتا ہے" نہ کہتے۔ مطلع یقیناً ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا ہے۔ اِسے ابتدائی کلام یعنی ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے کا قرار دینا چاہیے۔

(۱۰) اگر ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہیے ۔۔۔ نہ ہونے پر ہیں یہ باتیں دہن کی

یہ شعر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے رسالہ "اردوئے معلّیٰ" کے دہلی کے غالب نمبر حصّہ دوم،

۱۹۶۰ء میں چھاپا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میرے ایک بزرگ تھے سیّد عنایت حسین صاحب جو بھوپال میں ملازم تھے۔ نواب صدیق حسن خاں سے اُن کے خصوصی تعلقات تھے۔ نواب صاحب کے بھائی سیّد احمد حسن (متوفی ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء) غالبؔ کے شاگرد تھے اور عرشیؔ تخلص کرتے تھے۔ سیّد عنایت حسین صاحب نے اپنے منتخب اشعار کی ایک بیاض چھوڑی ہے۔ اس میں پہلے عرشیؔ کا یہ شعر لکھا ہے:

کہیں کچھ ہے، دعا دو گالیوں کو — بنائی بات باتوں میں دہن کی

اس کے بعد غالبؔ کا یہ شعر درج کیا ہے۔ اگر ہوتا الخ

عرشیؔ کا انتقال ۱۸۶۰ء میں ہوا۔ اگر اس نے اپنے استاد کی غزل پر غزل کہی ہوگی تو یقیناً ۱۸۶۰ء سے پہلے کہی ہوگی۔

(۱۱)

نسخۂ سوزشِ دل، درخورِ عناب نہیں، — سرِ سودا زدہ، آتشکدۂ تاب نہیں
ہمت و حوصلۂ شورشِ شبنم معلوم — قلزمِ اشک، نمِ دیدۂ خوناب نہیں
پرسشِ عشق سے ہے اُن کو فراغت مقصود — ہرزۂ پارۂ دل، نازشِ جلباب نہیں
ہمت و شوقِ طلبگاریِ مقصود کہاں — برقِ خرمن زنِ بے تابیِ سیماب نہیں
گلشنِ ہستیِ عالم ہے دبستانِ نشاط — نقشِ گل، رونقِ بے مشقیِ طلاب نہیں

اس غزل کا پہلا اور تیسرا شعر سب سے پہلے رسالۂ الناظر لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۲۹ء میں اس تمہید کے ساتھ شایع ہوا تھا: "مولوی عبدالرزاق صاحب ایڈیٹر رسالۂ تحفہ حیدرآباد دکن، مولفِ کلیاتِ اقبال نے عرصہ ہوا ازراہِ کرم الناظر میں شایع ہونے کے لیے اشعارِ بالا ارسال فرمائے تھے اور اُن کے متعلق اپنے گرامی نامے میں تحریر فرمایا تھا کہ — "یہ شعر بھوپال کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں اور نہ کہیں چھپے ہیں۔ میرے کتب خانے میں دیوانِ غالبؔ کے مختلف نسخے ہیں۔ ایک نسخہ نولکشور کا مطبوعہ ہے۔ اس کے حاشیے پر اشعارِ بالا اس تقریب کے ساتھ

کسی صاحب نے لکھے ہیں کہ مرزا غالب کے قلمی دیوان سے یہ غزل نقل کی گئی - دو شعروں کے علاوہ غزل کے اور شعر بھی ہیں، لیکن بیدرد جلد ساز نے حاشیہ کاٹ دیا ہے، جس کے سبب سے بعض مصرعے بالکل کٹ گئے ہیں اور بعض پڑھے نہیں جاتے ہیں اور پتا چلے تو بقیہ اشعار بھی ارسال کروں گا۔

بعد ازاں یہ شعر ماہِ نو فروری ۱۹۵۳ء میں مع چند اضافوں کے اس تمہید کے ساتھ چھپے "پچھلے صفحے پر غالب کی جو مبینہ غزل درج ہے، ہمیں جناب ناظر عالم نے حیدر آباد دکن سے ارسال کی ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس حد تک مستند ہے خط میں ناظر عالم صاحب نے اس غزل کی دریافت اور ضائع شدہ حصوں کے بارے میں عبدالرزاق راشد صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ موصوف نے کہا کہ "میاں داد سیاح شاگردِ مرزا غالب کے ایک رشتے دار ظفر یاب خاں ریاست حیدر آباد کے صیغۂ تعمیرات میں ملازم تھے۔ آج سے ۴۰، ۴۴ سال پہلے رسالہ ادیب نکالتے تھے۔ خاں صاحب موصوف کے کتب خانے میں ایک مجلد کتاب ملی جس کے اندر دیوانِ غالب اور دیوانِ ذوق کے علاوہ ناسخ، آتش، آباد کا کلام تھا۔ دیوانِ غالب کے ایک حاشیے پر "غزلِ غیر مطبوعہ غالب دہلوی" عنوان سے ۹ شعر لکھے تھے مگر کسی بیدرد جلد ساز نے جلد بناتے وقت حاشیے کا ایک حصہ اس بری طرح کتر دیا تھا کہ چار مصرعے کٹ گئے۔ جو اشعار اور مصرع باقی تھے، ان کی نقل کرلی گئی۔ اس تحقیق کے لیے کہ یہ کلام میرزا غالب ہی کا ہے۔ ظفر یاب خاں ایڈیٹر ادیب سے رجوع کیا گیا خاں صاحب موصوف نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ غالب کے سوا ایسے شعر اور کون تصنیف کر سکتا ہے...."

تحقیق کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ حضرت استاذی علامہ نظم طباطبائی شارح غالب سے رجوع کیا جائے۔ موصوف نے غزل دیکھ کر فرمایا کہ یہ یقینی مرزا غالب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔"

جو چار شعر جلد ساز کی غلطی سے کٹ گئے تھے، ان کے مصرع ہائے ثانی یہ ہیں ؎

شبِ تاریک، خیالِ دلِ مہتاب نہیں

شمع یہ، زیب دہِ مجلسِ احباب نہیں

تارِ تمکین، حریفِ سرِ مضراب نہیں

غم ہی ایک چیز ہے دنیا میں جو کمیاب نہیں

جب تک پہلے مصرعے نہ مل جائیں ان مصرعوں کو متن سے خارج کر دینا ہی مناسب ہو گا۔

اس غزل کا انداز وہی ہے جو نسخۂ امروہہ بخطِ غالب کی غزلوں کا ہے، اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء کا فکر کردہ کہہ سکتے ہیں۔ تقابل کے لیے اسی وزن کی ایک غزل نسخۂ امروہہ سے دیکھیے۔ وہی بھاری بھرکم الفاظ اور ترکیبیں، وہی دور کی کہنا اور فہم و ادراک سے اونچا اڑنا اس حد تک کہ شعر مہمل سا ہو کے رہ جائے۔ ذیل کی غزل دیوانِ غالب کے کسی اور نسخے میں شامل نہیں، لہٰذا اصل رنگ میں ہے ؎

وہ فلک رتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا
ماہ پرِ ہالہ صفت، حلقۂ فتراک چڑھا

نشۂ مے کے اتر جانے کے غم سے، انگور
صورتِ اشک بہ مژگانِ رگِ تاک چڑھا

بوسۂ لب سے ملی طبع کو کیفیتِ خال
مے کشیدن سے مجھے نشۂ تریاک چڑھا

میں جو گردوں کو بمیزانِ طبیعت تولا
تھا یہ کم وزن کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا

اے (اسد) وا شدنِ عقدۂ غم گر چاہے
حضرتِ زلف میں جوں شانہ، دلِ چاک چڑھا

دونوں غزلوں میں ایک بات اور بھی مشترک ہے وہ یہ کہ پرکرنی زبان استعمال ہوئی ہے۔ غزلِ زیرِ بحث کے ایک مصرع میں "تارِ تمکین" بہ اعلانِ نون آیا ہے اور مثال میں دی ہوئی غزل میں "میں جو گردوں کو بمیزانِ طبیعت تولا (یعنی میں تولا) میں نے تولا کی جگہ آیا ہے۔
اس سے اس بات کا امکان زیادہ ہو گیا ہے کہ دونوں غزلیں ایک ہی عہد کی ہیں۔

غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر

۱) ؎ گاتی تھیں شمرو کی بیگم، تن نا ہا یا ہو
دودھ میں پکے تھے شلغم، تن نا ہا یا ہو

مولوی احتشام الدین مرحوم نے اپنے مضمون "غالب کے بعض غیر مطبوعہ اشعار اور لطیفے" (ماہِ نو - فروری ۱۹۵۰ء) میں لکھا ہے کہ یہ "مطلع مرزا کی ایک مہمل غزل کا ہے جو بچّوں کے جھولے میں کلانے کے لیے موزوں فرمائی تھی۔" اندازہ ہے کہ شعر ۱۸۶۵ء کے ابتدائی مہینوں میں کہا گیا ہو گا (دیکھیے خط نمبر ۱۱۲ بنام ہرگوپال تفتہ آخر مئی ۱۸۶۵ء)

۲) ؎ تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ، روز افزوں

اس شعر کا پہلا مصرع مرزا نے نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام کے خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء میں اور پورا شعر انھیں کے نام کے خط مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۶۳ء میں لکھا ہے۔

۳) ؎ دِرَم و دام اپنے پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

آبِ حیات میں درج ہے کہ حسین علی خاں (عارف کا چھوٹا لڑکا) ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان (غالب) مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا اور آپ نے یہ شعر فرمایا۔

حسین علی خاں (شاداں) کا سالِ ولادت ۱۸۵۰ء ہے۔ اندازہ ہے اس واقعے کے وقت (آغازِ ۱۸۵۷ء) وہ سات آٹھ برس کا ہو گا۔

۴) ص سات جلدوں کا پارسل پہنچا　　واہ کیا خوب برمحل پہنچا

یہ شعر میرزا حاتم علی مہر کے نام کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء میں درج ہے۔

۵) ص یہ خبط نہیں تو اور کیا ہے

"برہانِ قاطع کا وہ نسخہ جس کے حاشیوں پر ابتداً مرزا صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ لکھے۔ اور جو بعد کو قاطع برہان کے نام سے مرتب ہو کر چھپے ...... لفظ 'خسک' پر حاشیہ لکھتے ہوئے یہ مصرع بھی مرزا صاحب کے قلم سے نکل گیا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۵۸ء ہی میں لکھا گیا ہوگا۔

۶) ص روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

غالب نے یہ شعر اپنے خط بنام مجروح مورخہ ۲ فروری ۱۸۵۹ء میں لکھا ہے۔

۷) ص دیکھیے کیا جواب آتا ہے

مندرجہ خط بنام مجروح ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء۔ یہ پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جو از خود موزوں ہو گیا ہے: "میں نے اس کا اپیل لفٹنٹ گورنر کے یہاں کیا ہے، دیکھیے کیا جواب آتا ہے"

۸) ص خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر
"فروغِ میرزا حاتم علی مہر"

مندرجہ خط بنام مہر۔ اپریل ۱۸۵۹ء۔ اس شعر کا دوسرا مصرع خود مہر کا ہے جو ان کی مثنوی 'شعاعِ مہر' میں درج ہے۔

۹) ص پیر و مرشد معاف کیجیے گا　　میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

مندرجہ خط بنام نواب انور الدولہ بہادر شفق۔ ۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء۔ عودِ ہندی میں یہ اسی طرح درج ہے۔ مگر اردوے معلّٰی میں اسے نثر کی شکل دے دی گئی ہے اگرچہ اسے منظوم بھی پڑھا جا سکتا ہے:

پیر و مرشد معاف کیجیے گا　　میں نے جمنا کا حال کچھ نہ لکھا

۱۰) س خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام
یہی ہے مذہبِ حق، والسّلام والاکرام

مندرجہ خط بنام مجروح - مئی ۱۸۶۱ء

۱۱) س تھا تو خط پر نہ تھا جوابِ طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

یہ شعر چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے خط میں لکھا ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں مگر قرائن سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۶۲ء کا لکھا ہوا ہے تفصیل کے لیے دیکھیے "غالب کے خطوط" جلد دوم ص ۶۱۱

۱۲) س میں بھولا نہیں تجھ کو، اے میری جاں
کروں کیا، کہ یاں گر رہے ہیں مکاں

مندرجہ خط بنام مجروح مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء

۱۳) س جو یارے حالِ دلی واں تو سلام لو

یہ مصرع خط مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء بنام مجروح، کا سرنامہ ہے۔

۱۴) س ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

مندرجہ خط بنام علائی - اپریل، مئی ۱۸۶۳ء (غالب کے خطوط حصہ اوّل ص ۲۰۸)

۱۵) س معلوم ہوا خیر کہ ٹھینگا باجا

مندرجہ خط بنام علائی ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء۔

۱۶) س کوئی اس کا جواب دو صاحب سائلوں کا ثواب لو صاحب

مندرجہ لطائفِ غیبی مطبوعہ ۱۸۶۴ء ص ۲۲ - اب یہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لطائفِ غیبی، سیاح کی نہیں بلکہ خود مرزا کی تصنیف ہے۔

۱۷) س خوشنودیِ احباب کا طالب، غالب

ظاہر ہے کہ یہ مصرع خط کے خاتمے کے الفاظ پر مبنی ہے۔ صحیح سالِ تحریر کا علم نہیں

مگر یہ ایک خط بنام قدر بلگرامی کے آخر میں (تاریخ درج نہیں صرف دن اور وقت لکھا ہے "چہار شنبہ بارہ پر تین بجے) اور مثنوی "شعاعِ مہر" کی تقریظ کو تمام کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۱۸) ؎ کھانا نہ انہیں کہ یہ پڑے ہیں آم

یہ غالب کی ایک رباعی کا چوتھا مصرع ہے۔ جو جلوۂ خضر میں درج ہے۔ اس کے تین مصرعے صفیر بلگرامی کو یاد نہیں رہے۔ صفیر ۱۸۶۵ء میں غالب سے ملنے دلی آئے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی طبع دوم ص ۱۴۴۔

۱۹) ؎ میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں　　بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

مندرجہ خط بنام صفیر بلگرامی مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۵ء۔

۲۰) ؎ ہاتفِ غیب سن کے یہ پہنچا　　ان کی تاریخ میرا تاریخا

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنی کتاب مکاتیب الغالب (ص ۳۵) پر لکھا ہے۔

"راقم الحروف (احسن مارہروی) کے پردادا شاہ سید عالم صاحب (صاحب عالم مارہروی) سے مرزا کی اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت صاحب نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپکی ولادت کس سنہ میں ہوئی اور یہ بھی اطلاع دی کہ میری ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتی ہے جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں مرزا نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ہاتفِ غیب الخ ——————"

جناب صاحب عالم مارہروی (جن کی مرزا بہت عزت کرتے تھے، مرزا سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور تین سال بعد فوت ہوئے یعنی ان کی ولادت ۱۲۱۱ھ کو اور وفات ۱۲۸۸ھ کو ہوئی۔ صاحب عالم ان کے صاحبزادے شاہ عالم اور عبدالغفور سرور (جن کے خطوں میں صاحبِ عالم مارہروی کے کئی خط شامل ہیں) کے نام کے خطوط جو آج تک دستیاب ہوئے ہیں وہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۶ء تک کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ یہ شعر ان خطوں میں درج نہیں۔ ہو سکتا ہے انھیں دنوں میں کبھی لکھا گیا ہو مگر خط محفوظ نہ رہا ہو۔ اس لیے اس شعر کو ۱۸۵۸ء کے بعد اور ۱۸۶۶ء سے پہلے کا کہا ہوا ہی کہا جا سکتا ہے۔

(۲۱) ؎ تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی
تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی

مندرجۂ خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۸۲۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا زمانۂ فکر ۱۸۶۶ء کے لگ بھگ ہوگا۔

(۲۲) ؎ سنین عمر کے ستّر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

غالب کا سالِ ولادت ۱۷۹۷ء ہے۔ اس طرح یہ شعر ۱۸۶۷ء میں کہا گیا ہوگا۔ ہجری حساب سے ستر برس ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں پڑیں گے۔

(۲۳) ؎ آج یک شنبے کا دن ہے آؤ گے؟ یا فقط رستا ہمیں بتلاؤ گے

خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۱۸ میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ پیارے لال آشوب دہلی میں ہوتے تھے تو کوئی ہفتہ مرزا صاحب کی ملاقات سے خالی نہ جاتا تھا۔ دیر ہو جاتی تو مرزا ایک نہ ایک شعر لکھ کر آشوب کے پاس بھیج دیتے "جس کا مضمون حسنِ طلب ہوتا"۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔ غالب نے دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کیا تھا اس مقدمے میں پیارے لال آشوب (جو ابھی ۲۶ سال کے بھی نہ تھے) گواہوں میں سے ایک تھے۔ شاید یہ شعر انھیں دنوں کا ہو۔

مندرجۂ بالا اشعار کی کوئی ادبی حیثیت نہیں۔ یہ غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کا آئینہ ہیں۔ ان کی قدر و قیمت اس پر منحصر ہے کہ یہ غالب کے کہے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے، انہیں دیوانِ غالب میں شامل کرنا محض دیوان کا حجم بڑھانا ہوگا۔

دیوانِ غالب ۔ طبعِ اوّل

غالبؔ، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب) کو، مطبع سیّد الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"...... دیوانِ ریختہ کہ در نا تمامی تمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بہ تمامی وانگاہ بنظر گاہِ سامی رسد ......"[1]

(ترجمہ: (میرا) دیوانِ اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے، مکمل ہے، عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپکی نگاہِ عالی سے گزرے ....)

اِس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوم یہ کہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمل ہے یعنی منتخب ہے۔ سرورق کے مطابق، بالآخر، دیوان شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء کو چھپ گیا۔ دیوان کے ص ۱۰۴ پر ایک رباعی درج ہے[2]

ہیں شہر بیں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں اسفل و عالی باہم
ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

۱۔ پنج آہنگ، طبع اوّل ۱۸۴۹ء ص ۳۸۸

۲۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، اشاعتِ دوم۔ مقدمہ ص ۱۲۷

عرشی صاحب مرحوم اس رباعی کے پیشِ نظر لکھتے ہیں :

"....... شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں مرزا صاحب کا دیوان اس مطبع (سیدالاخبار) میں چھپنا شروع ہوا، اور ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) تک زیرِ طبع رہا۔ تاریخِ آغاز سرورق پر مذکور ہے، اور ۲۷ رمضان تک اختتام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ رباعی بھی شامل ہے : ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم اور از روے حساب دوالی اور شبِ قدر کا اجتماع اسی تاریخ کو ہوا تھا"

مگر یہ دونوں دلیلیں ضعیف ہیں۔ دیوان کے سرورق پر یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طباعتِ دیوان کی تاریخِ آغاز ہے۔ اگر تاریخِ آغاز کی نشاندہی منظور ہوتی تو دن کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح رباعی سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شبِ قدر اور دیوالی کے اجتماع کی تاریخ گزر چکی ہے۔ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں اس لیے خوش (ہو کر گلے مل رہے) ہیں کہ اب کے شبِ قدر اور دیوالی بھی ایک ہی تاریخ کو باہم بغل گیر ہونے والی ہیں۔ رباعی یقیناً ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) سے پہلے کہی گئی ہو گی۔ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو دور از قیاس ضرور ہے کہ طباعت سے مہینوں پہلے مسودے کی کتابت کرائی گئی ہو اور طباعت کے دوران میں یکایک ایک رباعی کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ چھپے ہوئے دیوان میں یہ رباعی جس مقام پر ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام مسودہ ایک ہی قلم سے سلسلہ وار لکھا گیا تھا۔

دیوان میں درج شعروں کی تفصیل یہ ہے :

غزلیات کے اشعار	۹۹۸
۲ مصرعے جو غزل میں چھپنے سے رہ گئے مگر غلط نامہ میں موجود ہیں[1]	۱
	۹۹۹

[1] دیوانِ غالب ص ۱۹۔ غزل کا پہلا مصرع یہ ہے "یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا"

۹۹۹

قصیدوں، قطعوں، رباعیوں کے اشعار

۹۷
۱۰۹۶

ص ۵۹ پر چھپے ہوئے ۳ شعر حقیقت میں قطعے[1] کے ہیں جو ص ۱۰۰ پر درج ہے اور اس میں شامل ہیں۔ اس طرح مجموعی تعدادِ اشعار ۱۰۹۳ رہ جاتی ہے۔ اب اگر معلوم ہو کہ یہ ۱۰۹۳ اشعار، کم از کم ۲۹۹۶ اشعار سے منتخب کیے گئے ہیں[2] تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ غالب نے اپنے "دیوانِ ریختہ" کو "درنا تمامی، تمام" کیوں کہا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ دیوان صرف چھاپنے کی حد تک مکمل ہے حقیقت میں مکمل نہیں کیونکہ منتخب ہے۔

غالب کے دیوانِ ریختہ کے پانچوں ایڈیشنوں میں ان کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے مگر اس پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ دیوانِ غالب (نظامی بدایونی طبعِ ثانی)[3] میں پہلی بار یہ تاریخ درج کی گئی ہے۔ نظامی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں

"اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اُسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بزبانِ فارسی مصنف نے لکھا ہے کہ جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہٖ درج کیا گیا ہے ...." [4]

۱۔ "گلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں" معلوم ہوتا ہے اس شعر کو قطعے سے الگ کر کے باقی تین شعروں کو غالب نے عمداً غزلوں میں درج کیا تھا لیکن مکمل قطعہ بھی شامل کر لیا مگر غزل میں سے تینوں شعر خارج کرنا بھول گئے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ غلطی درست کر لی گئی۔

۲۔ دیکھیے ۱۸۰۷ء سے ۱۸۴۳ء تک کے اشعار۔

۳۔ اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۳ء ص ۵۔ اور متن دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔

اس ایڈیشن میں غالب کے دیباچے کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے۔

"دیباچہ جو خود مصنّف نے وقتِ ترتیبِ دیوانِ ہذا بزبانِ فارسی لکھا"

آخر میں تاریخِ دیباچہ[1] اس طرح درج کی ہے:

"بست و چہارم شہر ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۸ھ"

جو مطابق ہے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کے۔

نظامی مرحوم کو وہ دیوان جس میں یہ دیباچہ مع تاریخِ تحریر درج ہے کہاں سے ملا تھا؟ اس کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر سیّد عبداللطیف کی کتاب میں شائع شدہ ایک خط کے ذریعے ملتی ہے جو نظامی مرحوم نے سر اکبر حیدری کے نام ۳ دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا[2]۔ نظامی فرماتے ہیں:

"قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے...... ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوقؔ) کے ذریعے سے مجھے رام پور میں دستیاب ہوا تھا.........."

چند لفظی تراجیم[3] سے قطعِ نظر نظامی بدایونی کا نقل کردہ دیباچہ وہی ہے جو آٹھ سال کے بعد (۱۸۴۱ء) سے شائع ہونے والے پانچوں ایڈیشنوں میں شامل ہے۔

۱۔ اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۳ء ص ۵، اور متنِ دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے

۲۔ غالب از ڈاکٹر سید عبداللطیف (انگریزی سے ترجمہ) مطبوعہ حیدرآباد۔ ۱۹۲۲ء ص ۱۳۵

۳۔ مثلاً طباعت کے وقت 'درخاکسترِ خویش' کو 'بہ خاکسترِ خویش'، 'کم مایہ' کو 'اندک مایہ' بنا دیا گیا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ دیوانِ غالب لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے میں طباعت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اب ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو اس کا دیباچہ لکھ کر اسے کاتب کے حوالے کرنا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ دیباچہ تو لکھا گیا مگر مسودہ کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا شاید اس لیے کہ ابھی نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر و رخشاں نے اس کی تقریظ مکمّل نہیں کی تھی۔ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ (۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء تا ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء) میں مکمّل ہوئی۔ اُس وقت اس میں غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی ملا کر کل اشعار "یک ہزار و ہفتاد و اند"[1] تھے[2]۔ یعنی ۱۰۷۰ سے کچھ اوپر (۱، ۲، ۳ سے ۹ تک کچھ بھی)۔ لیکن جب دیوان، دیباچہ و تقریظ کے ساتھ چھپنے کے لیے دیا گیا تو اُس میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ۱۰۹۶ شعر[3] چھپے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۳۳ء تک دیوان کے اشعار ۱۰۷۱ تھے[4] بعد میں ۱۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا[5]۔ جو ۲۷ شعروں میں سے لیے گئے تھے۔ تقریظ مشمولۂ دیوانِ مطبوعہ میں لفظی تغیر و تبدّل بھی ہوا، اور مختلف ایڈیشنوں میں سنین اور تعدادِ اشعار میں ترامیم[6] بھی ہوئیں۔

---

۱ آثار الصنادید، مطبوعہ نولکشور جون ۱۸۷۶ء باب چوتھا ص ۸۵ "سنہ مقدسہ ہجریہ نبویہ ...... یک ہزار و دویست و پنجہ و چار ....."

۲ ایضاً ایضاً ایضاً ۸۶

۳ دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن)۔ تقریظ میں تعدادِ اشعار "ہزار و نود و شش اند" لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔

۴۔۵ دیکھیے ۱۸۰۷ء سے ۱۸۲۱ء تک کے تم نشان والے اشعار

۶ ایک شعری ترمیم دلچسپ ہے۔ تقریظ میں شامل مثنوی کا تیسرا شعر آثار الصنادید میں اس طرح ہے۔

نہیں فرزند نہ آبائے علوی
نہیں شاگردِ روح القدسِ عالی

اس کے مصرع ثانی کو دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن) میں یوں کر دیا ہے ع دمِ روح القدس در کشفِ معنی، پھر بعد کے ایڈیشنوں میں یہ شکل دے دی ہے ع نہیں شاگردِ عقلِ کلِ عالی۔

۱۸۳۳ء کے بعد جن ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا وہ یہ ہیں

دیوانِ غالب ص ۵۳	دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو [1]	۹ شعر نسخۂ بدایوں ۱۸۳۸ء
ص ۵۸	تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۲ شعر حاشیہ ایضاً بعد از ۱۸۳۸ء
ص ۶۵	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب	۱ شعر گلشن بے خار اپریل ۱۸۳۵ء
ص ۸۴	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۳ شعر نسخۂ بدایوں، حاشیہ بعد از ۱۸۳۸ء
ص ۸۶	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۴ شعر - ایضاً -
ص ۱۰۰	گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری	۲ شعر - ایضاً -
ص ۱۰۴	بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال	۲ شعر - ایضاً -
ص ۱۰۴	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	۲ شعر منتخب قلمی سرور والی باہم ۱۸۴۱ء
		۲۵ شعر

مندرجہ بالا سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) دیوانِ غالب، اوّلیں طباعت کے لیے لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے تک مکمل ہو چکا تھا

(۲) اس میں ۱۰۷۱ اشعار تھے۔[2]

---

[1] بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو

یہ شعر بعد میں متداول دیوانِ غالب سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اب متداول دیوان میں اس غزل کے ۹ کے بجائے ۸ شعر شامل ہیں۔

[2] اگر جدول میں، جو تعارف میں دی جا چکی ہے، دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۳۳ء تک متداول دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد ۱۰۷۱ نہیں بلکہ ۱۰۴۳ ہے۔ تاہم دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ۱۸۳۳ء تک ۱۰۷۱ اشعار ہی شامل کراتا تھا

۱۴) یہ اشعار ۲۹۶۶ اشعار میں سے منتخب ہوئے تھے (بعد میں ۱۸۴۱ تک کے فکر کردہ

کیے گئے تھے۔ یہ کیونکر ہوا۔ اس کے لیے "نگاہ" میں پورا "جمع خرچ" رکھنا پڑے گا۔ ملاحظہ کیجیے:

۱۸۳۳ تک دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد ۱۰۷۳

متداول دیوان میں قصیدہ "یک ذرہ..." کے ۲۸ شعر

ہیں مگر پہلے ایڈیشن (ص ۹۵/۹۶) میں صرف ۲۵ شعر درج ہیں۔ اس طرح

اشعار کم ہوئے ۳ −

۱۰۷۰

پہلا ایڈیشن ص ۲۹/۳۰ غزل "میرے بعد" کے ۸ شعر ہیں۔ متداول

دیوان میں بعد ازاں یہ شعر اضافہ ہوا ؎

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی

اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

یعنی یہ شعر پہلے ایڈیشن میں نہیں ۱ −

۱۰۶۹

یہ ۲ شعر بھی پہلے ایڈیشن میں نہیں ؎

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر

مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

محابا کیا ہے؟ مَیں ضامن، اِدھر دیکھ

شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ۲ −

۱۰۶۷

یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۷۰) میں ہے مگر بعد میں حذف کر دیا گیا

؎ ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم

ہر موجِ گردِ راہ، مرے سر کو دوش ہے ۱ +

۱۰۶۸

قطعے کے شعر جو پہلے ایڈیشن میں ص ۵۹ اور ص ۱۰۰ پر دو بار چھپ گئے

"کلکتہ کا جو ذکر کیا..." ۳ +

پہلے ایڈیشن میں ۱۸۳۳ تک کے کل منتخب اشعار ۱۰۷۱

۲۷ اشعار میں سے ۲۵ شعر مزید منتخب ہوئے۔ اِن ۲۷ شعروں کے اضافے سے اس وقت تک کے کہے ہوئے اشعار کی تعداد 2981 ہو گئی)

۴) اس کا دیباچہ غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو ختم کیا۔

۵) تقریظ نواب ضیاالدین احمد خاں نیّر و رخشاں نے ۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء اور ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت لکھی۔ قیاسِ غالب یہی ہے کہ ۱۸۳۸ء ہی میں لکھی۔

۶) طباعتِ دیوان کے وقت اس میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا اور کل شعر ۱۰۹۶ ہو گئے۔ (کاتب نے ایک غزل کے دو مصرعے حذف کر دیے تھے۔ جس کی وضاحت غلط نامہ میں موجود ہے۔ اس طرح اشعار جو متن میں درج ہیں، شمار میں ۱۰۹۵ ہیں مگر حقیقت میں ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دوبارہ درج ہو گئے۔ وہ کم کیے تو دیوان کا مواد ۱۰۹۳ اشعار پر مشتمل رہ گیا)

۷) دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء کو دہلی میں سیّد محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ "(مطبع سیّد الاخبار) میں چھپا۔

دیوانِ غالب (طبع اوّل) بہت کم یاب ہے۔ جناب مالک رام فرماتے ہیں[1]۔

"ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ خدا معلوم اب کہاں ہے۔ خان بہادر سیّد ابو محمد مرحوم کا نسخہ آزاد لائبریری، علی گڑھ میں آ گیا ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری، رامپور میں اور دوسرا جامعہ ملّیہ اسلامیہ (دلّی) کے کتب خانے میں ہے"[2]

جناب عرشی مرحوم، صولت پبلک لائبریری، رامپور کے نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"سر ورق کی پہلی سطر کے آخر میں لفظِ تخلص کے اوپر سیّد محمد خاں

---

[1] ذکرِ غالب۔ طبع پنجم ص ۱۶۷

[2] دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ص ۱۲۸۔ مقدمہ

کے دستخط ہیں ________ "

میرے کتب خانے میں اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور صولت پبلک لائبریری، رام پور والے نسخے کا عکس بھی ہے۔ جب تک میں نے عرشی صاحب کا بیان نہیں پڑھا تھا اور صولت پبلک لائبریری والے نسخے کا عکس نہیں دیکھا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ سرورق کے لفظ تخلص پر بے معنی سا نشان حقیقت میں سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔ بہرحال مجھے یہ بتاتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ میرے دو نسخوں میں سے ایک پر یہی دستخط بعینہٖ اسی جگہ موجود ہیں۔ وجہ نامعلوم۔

دیوان ۱۰۹ صفحوں ہی کو محیط ہے۔ پہلا صفحہ سرورق کا ہے۔ دوسرا صفحہ خالی ہے۔ صفحات میں ۹۲ کا عدد دو دفعہ آ گیا ہے مگر ص ۱۰۳ کے بعد ص ۱۰۴ چھوٹ گیا ہے، اس طرح پلڑے برابر ہو گئے ہیں۔

یہ ایڈیشن اتنا کم یاب ہے کہ مدتوں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی رہیں۔ اب اس سے پہلے کہ باقی دو چار نسخے بھی دیمک یا وقت کی بھینٹ چڑھ جاتے میں نے اس کا عکسی ایڈیشن شائع کر کے اسے عام کر دیا ہے۔

غالب کی زندگی میں دیوانِ غالب کی اشاعت

(دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعداد اشعار)

(و) غالب نے اپنے اردو دیوان کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ[1] (۱۶/ اپریل ۱۸۳۳ء) کو تمام کیا۔ تقریظ پانچ سال بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ۱۲۵۴ھ ۳۹-۱۸۳۸ء میں لکھی۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء کو اس سرِورق کے ساتھ چھپا۔

دیوان اسد اللہ خانصاحب غالب تخلص
مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانے کے
لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان
۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ عیسوی کو سید عبد الغفور کے
اہتمام میں چھاپا ہوا

(ب) دیباچۂ غالب یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ

مشامِ شمیم آشنایانِ راصلا، ونہادِ انجمن نشیناں را مژدہ کہ نسخی از سامانِ مجمرہ

---

[1] "تمام نسخوں میں تاریخ نہیں ملتی۔ سب سے پہلے مولانا نظامی بدایونی نے منشی احمد علی شوق قدوائی کے علاوہ نسخے سے اپنے شائع کردہ دیوان کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا اضافہ کیا تھا۔"

گردانی آماده، و دامنی از عودِ هندی دست بهم داده است ۔ نه چو بهای سنگ ترپ خورده به هنجارِ ناطبیعی شکسته، بی اندام تراشیده، بلکه به تیز تنگافته، بکار در ریزه ریزه کرده، به سوهان خراشیده۔

آیدون نفس گداختگیِ شوق به جستجوی آتشِ پارسی است ۔ نه آتشی که در گلخنهای هند افسرده و خاموش، و از کفِ خاکستر، مرگ خودش سیه پوش بینی ۔ چه بروی مسلّم است، از ناپاکیِ استخوان مرده ناپارسی شکستن، و از دیوانگی بر رشتهٔ شمعِ مزار کشته آویختن هر آیینه بدسگالان خلق نیرزد، و بزم افروختن را نشاید ۔ برخِ آتش به مغ برافروزنده، و آتش پرست را بیاد افزاده هم در آتش سوزنده نیک میداند که پژوهنده در هوای آن رخشنده آذر نعل در آتش است که چشم روشنی هوشنگ از سنگ برون تافته، و در ایوانِ لهراسپ نشو و نما یافته، خس را فروغ، و لاله را رنگ، و مغ را چشم، و کده را چراغ ۔ بخشنده یزدانِ درون بهمن برافروزد را سپاس گزاری ازان آتشِ تابناک بخاکستر خویش یافته، بکاوکاوِ سینه شتافته ام، و از نفس دمه بر آن برنهاده بو که در اندک مایه روزگاران آن مایه فراهم تواند آمد که حجره را فرّ روشنائی چراغ و را لخلخه عود را بالِ شناسائی دماغ تواند بخشید ۔

همانا نگارندهٔ این نامه را آن در سر است که پس از انتخاب دیوانِ ریخته به گرد آوردنِ سرمایهٔ دیوانِ فارسی برخیزد، و باستظهار کمالِ این فرپوزن بس زانوی خویشتن نشیند ۔ امید که سخن سرایانِ سخنور ستای، پراگنده ابیاتی را که خارج ازین اوراق یابند، از آثارِ تراوشِ رگِ کلک این نامه سیاه نشناسند و جامه گرد آورنده را در ستایش و نکوهشِ آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند ۔

یارب، این بوی هستی ناشنیدهٔ از نیستی به پیدائی نارسیده، یعنی نقشِ بر ضمیر آمدهٔ نقاش که به اسداللہ خان موسوم و به میرزا نوشه معروف و به غالب متخلص است، چنانکه اکبرآبادی مولد و دهلوی مسکن است، فرجامِ کار نجفی مدفن نیز بادا فقط ۔

(ج) نواب ضیاالدین احمد خاں کی تقریظ یہ ہے۔

تقریظ[1]

"بنا میزد نہی بالا ناطورہ الیست، از قدسی خانوادۂ فکر سر برزدہ، گرم جلوہ گری و لاابالی خرام محجوبہ الیست، مقنعہ از رخ برداشتہ و دامن بکمر زدہ، در اندازِ پردہ دری۔ یوسفستانی است معور از شہزادانِ معانی در روی دوش بدوش۔ عبہر زار لیست جلوہ گاہِ حیرتیانِ باختہ ہوش۔ پہنا ورپرندلیست، مانندِ سپہرِ ثوابت، گوہر آگین۔ معمور تق رونق شارستانیست، کارنامہ شکنِ صد نگارخانۂ چین۔ فروغانی چراغیست پری پروانہ۔ سماوی ہیکل ست حرزِ بازوے فرزانہ۔ گوئی میکائیل نوال موکل فراخ سماطی نہادہ است، و برگرسنہ چشمانِ سخن راصلای عام در دادہ۔ بیت اللہ تقدس معبدلیست کہ کلیدش بدستِ فہم درست دادہ اند، و درش براحرام بندانِ مزدلفۂ دل کشادہ۔ سومناتیست یک صنمستان زنار بندانِ خیال در روی جبین سای۔ ارتنگیست بنالشِ

---

[1] یہ تقریظ وہ ہے جو دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔ بعد کے ایڈیشنوں میں تقریظ تصنیف اور تعدادِ اشعار کے علاوہ معمولی سا ردوبدل ہوا ہے۔ جیسے محجوبہ کی جگہ محبوبہ، بدوش کی جگہ بر دوش، کارنامہ کی جگہ بارنامہ، برگرسنہ چشمانِ سخن کی جگہ صرف گرسنہ چشمانِ سخن، بہزاد کی جگہ ارژنگ، ہم بمغزوہم کی جگہ ہم بمغز پختہ و ہم، بہ سنجہ کی جگہ نسخہ، ہمہ ستاتاں کی جگہ ہمہ استاتاں، اشعار سے پہلے لفظ مثنوی کا اضافہ، مصرع دم روح القدوس در کشفِ معنی کی جگہ ہمیں شاگردِ عقلِ کلِ عالی، فرخندہ کنش کی جگہ فرو ہیدہ کنش، المتخلص بغالب کی جگہ غالب، پوزش آئین کی جگہ پوزش آئینِ نیاز گستر، ضیاالدین کی جگہ ضیار الدین نیز قطعہ رباعی کی جگہ قطعہ و مثنوی و رباعی، از ما کی جگہ از من، بر دیگراں کی جگہ برائے دیگراں وغیرہ۔

نقشہای بدیع پشتِ دستِ مانی و بہزاد بر زمین سای۔ ہر صفحہ ازین اوراق، بر ہیئت بیدہ عنوان۔ ہر ورق ازین کتاب مویدی است استادان۔ آئینہ خانہ ایست گیتی نما۔ صنعتکدہ ایست مصفا۔ پردہ گیانند محملِ نشین سُرادقِ مریم کرداری۔ بشوخ چشمانند پردہ در تر از شاہدانِ بازاری۔ تہی دستانند توانگر دل، آزادگانند پا در گل۔ عشاقِ طینانند بخویشتن سائل۔ سادہ پیکرانند نگارین دل۔ ہاروت پیشگانند زہرہ فن۔ بربی گوہرانند بابلِ مسکن۔ سمندرانند قلزم کش۔ تشنگانند سینہ پر آتش۔ برشتگانند پختہ مغز۔ ہم بمغز و ہم پیوست نغز۔ بادہ آشامانند سینہ سہت۔ از خود رفتگانند بایکدگر ہمدست۔ ہندی صنمانند پارسی گرد۔ دہلی تژادانند صفاہان پرورد۔

ہان وہان، ترسم کہ آئینہ سرودم بسختہ باختی ہمانا، منتخب دیوانِ اردو زبان است ریختہ کلکِ مسیحی فرتابِ خدامِ قسطاسِ دانش۔ اسطرلابِ بینش، جوہرِ آئینہ آفرینش۔ معیارِ نقدِ گرانمایگی، معراجِ سُلّمِ بلند پائگی، قہرمانِ قلمرو معنی پروری، فرمانفرمای کیہانِ سخنوری، گیتی خداینگانِ نوائین نگاری، جہان سالارِ تازہ گفتاری، روان بخشِ کالبدِ سخن گستری، بینائی افزای چشمِ دیدہ وری۔ فرازندۂ لوای شوکتِ خامہ، فروزندۂ چراغِ دودۂ آمہ، آیۂ ناسخِ شہرتِ ہمداستانان، سرخیلِ انجمنِ نکتہ دانان۔

سخن را از خیالش ارجمندی معانی را ز فکرش سربلندی
صریرِ خامہ اش بس دلپذیر است بہشتی عندلیبان را صفیر است
ہمیں فرزندِ نہ آبای علوی دمِ روح القدس در کشفِ معنی
جہان را بیدریغ آموزگار است گزین معنی شناسِ روزگار است
سر و سر دفترِ شیوہ بیانان درین فن، افتخارِ ہمہ زبانان
بجولانگاہِ معنی یکہ تازے فلاطون فطرتے، حکمت طرازے
ز کلکش ریزشِ گنجِ معانی چو ابرِ آذری، در دُر فشانی

ز صہبای سخن، سرشار گشتہ ورق، از فکرِ او، گلزار گشتہ۔ موحد کیشِ صافی منش ستودہ خوی فرخندہ کیش، بزرگ نہادِ پاکیزہ گوہر، فرشتہ سرشت آدم گستر، کیں گذارِ مہر

پرور، خورشید فروغ کیوان فر، نکوہشِ نکوہِ ستایشِ ستای، کشورِ معنی را دِہ خدای، سرتاسر وفا و فتوت، دیدہ تا دل حیا و مروت،

درکِ مصوّر، بروحِ مجسّم — عالمِ جہان، وجانِ عالم

والاحسب، عالی نسب، سَمیِّ وَصیِّ والپسین وَ عشورِ آداشِ حضرتِ چارمین دستور۔ اعنی استادی، مرشدی، مولائی، اخی، میرزا اسد اللہ خان بہادر المتخلص بہ غالب۔ اللّٰہمّ کمّلِ الکلام بِدیمومۃِ بقائہ، وَحصّلِ المرام بحیثونۃِ لقائہ!

پوزش آئینِ ضیاء الدین نیر، از دیربازِ والائی اندیشہ، بست در آن اندیشیدنے وگرانیِ قدرِ سنگ اندران سنجیدے، کہ این گرامی برادرزادہ ہا را، کہ یگان یگان خلف الصدقِ دومانِ ضمیر بل ابو الآبائی مضامینِ دلپذیر است، بتعلیمِ نو آموزانِ نواز بدنشناس برانگیزد، و این ارزندہ جواہر پارہ ہا را، کہ ہر ایک ازان بہین ساعدِ شخص غرد را پارہ، و نازنین پیکرِ ہوش را گوشوارہ است، برشمسۂ پیشِ طاقِ شناسائی برآویزد۔

بارے، کارسازِ ایزدِ بزرگ را ہزاران سپاس کہ درین زمان کہ سنہ مقدسہ ہجریہ نبویہ، علیٰ صاحبہا افضلُ التحیّاتِ وَ اکملُ الصّلواتِ، بہ ہر رو دولیت و پنجہ وچہار رسیدہ، آن دیرینہ بسیچ و دلنشین آرزو، بساعدتِ روزگار، راست ہنجار و قلاورزیِ بختِ بیدار، نوشتر ازان کہ میخواستم، روائی گرفت۔ شادکامی در دل جاگزید و اندوہ گردآوری بدر رفت۔

چون بہ احصای افرادِ این ہمایون صحیفہ شتافتم، ہمگی اشعارِ شعری شعارِ غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و نود و ہشت و اند¹ یافتم۔

آلا، یا توانا ہوشان، ہوشے! و شنوا گوشان، گوشے! بر شاہراہِ شناختِ فراوانیِ نیکو معانی باید رفت، نہ در پیغولۂ بیغارہ زنی غوردہ بر قلتِ ابیات گرفت چنانکہ خود آن والا

---

¹۔ تعدادِ اشعار کی بحث کے لیے دیکھیے پیش لفظ دیوانِ غالب (عکسی) [مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱] ۱۹۸۶، کالی داس گپتا رضا

آموزگار، در گزارشِ این ہنجار، بپارسی نامہ خویشتن در پردۂ ساز آن گفتار خودی سرایہ آرے، راست میسر باید۔ بیت:

نگویم، تا نباشد نغز، غالب ۔۔۔ چہ غم، گر ہست اشعارِ من اندک؟

از ما یادگارے وبہ دیگران تذکارے بادا! فقط"

دیوان کے آخری صفحے ۱۰۹ پر 'غلط نامہ' ہے۔

(د) دیوان میں کل اشعار ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دو بار چھپ گئے ہیں۔ اس طرح مواد کے لحاظ سے تعدادِ اشعار ۱۰۹۳ تسلیم کرنی چاہیے۔

(۲)

(ل) یہ ایڈیشن (دوسرا) مطبع دار السلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی سے مئی، ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا۔ دیباچہ پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے۔

(ب) تقریظ میں تاریخ تصنیف تقریظ ۱۲۵۴ھ ہی دی گئی ہے۔ مگر تعدادِ اشعار "غزل وقصیدہ وقطعہ ورباعی یک ہزار ویک صد واند" بتائی گئی ہے۔ عموماً اند (بمعنی چند) سے مراد ۱، ۲، ۳، سے ۹ تک ہے جیسے انوری سے ہمچو تاریخ نہصد و چل واند۔ تاہم دیوان کے کل اشعار ۱۱۵۸ ہیں۔

تقریظ کا لفظ ہٹا کر اس کی جگہ نثر رکھ دیا گیا ہے اور اس کے بعد بطورِ عنوان یہ عبارت (معلوم ہوتا ہے غالب کی طرف سے) بڑھا دی گئی ہے۔

"دمیدنِ سپیدۂ سحری از تیرہ شب سوادِ اوراق، بفر فروغ گستری عبارتِ تقریظ کہ پیدائیِ آن اثر لیست از آثارِ خرام خامۂ دلربا برادر، بدل نزدیک بجان برابر، عالی دودمان والا گہر، نواب ضیاالدین احمد خان بہادر، سلمہ اللہ تعالیٰ!

(ج) خاتمۃ الطبع کے طور پر یہ جملہ ہے "تمت تمام شد"۔

(د) جناب عرشی مرحوم دیوانِ غالب اردو (پہلی بار - ۱۹۵۸ء ص ۹۷ دیباچہ) میں دوسرے ایڈیشن ۱۸۴۷ء کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"نیر کی تقریظ میں تاریخ ۱۲۶۳ھ ہی ہے مگر اشعار کی تعداد "یک ہزار و یک صد و اند" بنادی گئی ہے گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھادیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں (پہلے اور دوسرے) کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا اضافہ ہوا ہے جس کے ۱۴ شعر ہیں۔"

اس سے پہلے ص ۹۶ پر عرشی صاحب کہہ چکے ہیں کہ پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۹۸ یا (۳ شعر جو دوبارہ چھپ گئے ہیں کم کرکے) ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں (۱۰۹۸+۱۴) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۵+۱۴) ۱۱۰۹ شعر ہوئے۔

پھر اسی دیوان کی اشاعتِ دوم (۱۹۸۲ء - ص ۱۳۲ مقدمہ) میں وہی بات دہراتے ہیں۔ صرف یہ ترمیم کرتے ہیں کہ "چودہ شعر" کی جگہ "سولہ شعر" بنادیتے ہیں۔ جس کا سبب بسینی روٹی والا دوشعر کا قطعہ ہے جو پہلے ان سے گنتی میں چھوٹ گیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کے اشعار کے شمار میں جو سہو ہوگیا تھا وہ بھی دیباچے کے ص ۱۳۱ پر درست کرلیا گیا ہے۔ اب شعر ۱۰۹۶ یا (۳ شعر کم کرکے) ۱۰۹۳ دیے گئے ہیں۔ جو قطعی درست ہے۔ مگر عرشی صاحب کی اس ترمیم کے باوجود دوسرے ایڈیشن میں اب بھی تعدادِ اشعار وہی رہی یعنی (۱۰۹۶+۱۶) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۳+۱۶) ۱۱۰۹ شعر۔

جناب مالک رام بھی دیوانِ غالب (تاریخ اشاعت فروری ۱۹۶۹ء) کے ص ۷ پر 'تعارف' میں دوسرے ایڈیشن کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۱ بتاتے ہیں۔ پھر دیوانِ غالب صدی ایڈیشن (جو ظاہر ہے ۱۹۶۹ء ہی کی تالیف ہے) کے ص ۱۹ پر رقم طراز ہیں۔

"اس نسخے میں (۱۱۱۱) شعر ہیں، یعنی طبعِ اوّل سے ۱۶ زیادہ: ایک تو وہی بسینی روٹی والا دو شعروں کا قطعہ ہے۔ دوسری "جاں کے لیے" کی زمین

کی آخری غزل، جس میں نواب تجمل حسین خاں کی مدح کا قطعہ ملتا ہے۔ اس میں چودہ شعر ہیں ——"

اس سے پہلے ص ۱۶ پر جنابِ مالک رام بھی پہلے ایڈیشن میں (۱۰۹۸-۳) ۱۰۹۵ شعر ہی بتاتے ہیں۔ اس طرح اس تعداد میں ۱۶ اشعار کا اضافہ کر کے میزان (۱۱۱۱) ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں بھی جنابِ مالک رام "گفتارِ غالب" (ص ۱۶۷ اور ص ۱۶۹) میں یہی بات دہراتے ہیں۔

عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کی دونوں اشاعتوں میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ دیوانِ غالب کے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے ایڈیشنوں کے مقابلے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۲ یا ۱۱۰۹ ہے۔ یعنی پہلے ایڈیشن کے تمام ۱۰۹۶ یا ۱۰۹۳ اشعار، اور ۱۶ مزید اشعار، مل کر دوسرے ایڈیشن کا کل اثاثہ بنتے ہیں۔ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "چھے برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل سولہ شعر کہے تھے۔"

عرشی صاحب معتبر ترین محققوں میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے جنابِ مالک رام نے عرشی صاحب کے دعوے کو من و عن تسلیم کر لیا مگر حیرت اس بات پر ہے کہ عرشی صاحب دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی بڑی چوک کیونکر کر گئے۔

اب حقیقتِ حال ملاحظہ فرمایئے۔

— پہلے ایڈیشن کے کل شعر ۱۰۹۶

— کلکتہ کا جو ذکر ..." والے قطعے کے شعر جو سہواً دوبارہ چھپ گئے۔ -۳

۱۰۹۳

— یہ ۲ شعر پہلے ایڈیشن میں ہیں مگر دوسرے میں نہیں

۵ دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں (ص ۴۹)

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو (۵۳) -۲

۱۰۹۱

گویا دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے ۱۰۹۶ نہیں بلکہ ۱۰۹۱ اشعار ضم ہوئے۔
اب دیکھنا چاہیے کہ دوسرے ایڈیشن میں نئے شعر کتنے لیے گئے۔

— قطعہ ~ نہ پوچھ اس کی حقیقت ..... بیسن کی روغنی روٹی ۲

— غزل ~ نوید امن ہے بیدادِ دوست، جاں کے لیے ۱۴

— " ~ کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ۹

— " ~ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۱۲

— " ~ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۱۳

— " ~ کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں ۱۱

— پہلا ایڈیشن ص ۲۵ غزل میں ایک شعر کا اضافہ ہوا

~ محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ۱

— پہلا ایڈیشن ص ۲۹ - غزل میں ایک شعر کا اضافہ

~ خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد ۱

— یہ شعر دیوان میں بڑھایا گیا ~

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی ۱
(دوسرے ایڈیشن میں سہواً ہجراں کی جگہ بیجاں چھپ گیا ہے)

— پہلا ایڈیشن ص ۹۵ "منتخب قصیدہ منقبت علی مرتضیٰ ؑ علیہ السلام" - اس سے ۳ شعر حذف کر دیے گئے تھے اب وہ دوسرے ایڈیشن میں بحال کر دیے گئے ہیں۔ محذوف اشعار کے شروع کے لفظ یہ ہیں (۱) وہ شہنشاہ (۲) فلک العرش (۳) سبزۂ چمن ۳

۴۷

میزانِ اشعارِ تو جو داخلِ دیوان ہوئے — ۶۷

میزانِ اشعار (پہلا ایڈیشن) — ۱۰۹۱

دیوانِ غالب (دوسرا ایڈیشن) کے کل اشعار — ۱۱۵۸

(۳)

(ا) یہ ایڈیشن (تیسرا) "در مطبع احمدی باہتمام امو جان طبع" ہوا تھا۔ دیباچے میں کوئی ترمیم نہیں۔

(ب) تقریظ میں سنہ ۱۲۷۱ھ کر دیا گیا ہے اور تعدادِ اشعار ۱۶۹۵ لکھی گئی ہے حالانکہ صحیح تعداد ۱۷۹۶ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

(ج) تقریظ کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں (جنھیں اس دیوان میں کم از کم دو بار نواب محمد ضیاء الدین خاں لکھا ہے) کا قطعۂ تاریخ انطباعِ دیوان" ہے ؎

ہوا ہے حضرتِ غالب کا منطبع دیوان — صلائے فیضِ بگوئندگانِ ریختہ ہے
یہی کتاب ہے جس میں کہ اوستاد نہ — بیانِ ریختہ ہے اور زبانِ ریختہ ہے
بنائے ریختہ استاد ہی نے ڈالی ہے — اسی سے قائم اساسِ جہانِ ریختہ ہے
زمینِ شعر میں اترا ہے لشکرِ ابیات — سو یہ رسالہ نامی نشانِ ریختہ ہے
بنائے ریختہ ۱۲۷۰ ایک اور دوسری تاریخ — بدھن نیر و رخشاں بیانِ ریختہ ہے ۱۲۷۱ھ

ایک اور قطعۂ تاریخ درج ہے جو مرزا یوسف علی خاں عزیز شاگردِ غالب کا طبع زاد ہے ؎

سرورِ ریاضِ فضل محمد حسین خاں — ہیں رونقِ بہارِ گلستانِ ریختہ
کہتے ہیں شعر خوب، سمجھتے ہیں شعر خوب — تحسین تخلص اور زباں دانِ ریختہ
چھاپا انھوں نے حضرتِ غالب کا کلیات — وہ کلیات جس سے بڑھے شانِ ریختہ
غالب کا میرزا اسد اللہ خاں ہے نام — ہے واقعی وہ شیرِ نیستانِ ریختہ

لکھی عزیزِ خستہ نے تاریخ انطباع　　حاسدکے سر کو کاٹ کے دیوانِ ریختہ

عبارت خاتمۂ دیوان۔ "داد کا طالب غالب، گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوانِ اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین میر قمر الدین کی کار فرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرفِ غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا؟ ناچار جا بجا یونہی چھوڑ دیا۔ یعنی 'کِسو' بکافِ مکسور و سینِ مضموم و واوِ معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح 'کسی' ہے۔ واو کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ 'کسو' بہ واو ہے اور سب جگہ 'کسی' بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے؟ اللہ بس، ماسوا ہوس۔"

آگے یہ عبارت درج ہے۔

"مطبع احمدی میں واقع دلہای امو جان کے اہتمام سے بیستویں محرم الحرام ۱۲۷۸ھ ہجری کو مطبوع ہوا۔"

(د)　معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں جب غالب نے اپنے دیوان کے تیسرے ایڈیشن کے لیے مسودہ تیار کیا تو جیسا کہ تقریظ میں لکھا گیا، مندرجہ اشعار کی تعداد ۱۶۹۰ اور چند تھی۔ پھر جب انھوں نے ۱۲۷۱ھ (۲۴ ستمبر ۵۴ء تا ۱۲ ستمبر ۱۸۵۵ء) میں یا اس کے کچھ عرصے بعد اپنا دیوان نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ رام پور کو تحفے میں بھیجا۔ تو اس میں ۱۷۹۵ شعر درج کیے گویا ۱۰۴ اشعار کا اضافہ کیا۔ (کیونکہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ "۱۶۹۰ اور چند" سے مراد ۱۶۹۱ اشعار تھی)۔

جب اسی دیوان کی نقل لے کر اور اس میں ذیل کا شعر

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

اضافہ کر کے اسے آخرِ جولائی ۱۸۶۱ء کو مطبعِ احمدی دہلی سے چھپوایا تو اس میں تعدادِ اشعار ۱۷۹۶ ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام اشعار ۱۸۵۷ء یا اس سے پہلے کے کہے ہوئے ہیں، اور جو اشعار "۱۶۹۰ اور چند" کی تعداد کی تحت میں آتے ہیں وہ تقریباً ۱۸۵۴ء کے وسط تک کہے جا چکے تھے۔ لہٰذا اضافہ (جو میری دانست میں، مندرجۂ بالا ایک شعر کے علاوہ، ۱۰۴ اشعار کا ہے) ذیل کے کلام پر مبنی ہے:

قطعہ	اے شہنشاہِ آسماں	۳۰ شعر
"	نصرت الملک بہادر	۷ "
"	ہے چہار شنبہ	۵ "
"	سہل تھا مسہل	۲ "
"	سیہ گلیم ہوں	۲ "
"	گو ایک بادشاہ	۲ "
مثنوی	ہاں دلِ دردمند	۳۳ "
رُباعی	اِن سیم کے بیجوں	۲ "
غزل	اعتقاد نہیں (قافیہ، ردیف)	۷ "
"	کنشت کو (" ")	۴ "
"	بہار آئی (" ")	۷ "
"	شہریار کی (" ")	۳ "
	میزان	۱۰۴ شعر

تقریظ میں تاریخِ تقریظ تو ۱۲۷۱ھ (۵۵/۱۸۵۴ء) کر دی ہے مگر تعدادِ اشعار وہی "یک ہزار و شش و نود و پنج واند" (پنج، اضافۂ کاتب ہے لکھی گئی) جو حقیقت میں ۱۷۹۵+۱=۱۷۹۶ ہے۔

(۴)

(ا) یہ ایڈیشن (چوتھا) "مطبع نظامی واقع کانپور" میں چھپا۔ دیباچے میں کوئی ترمیم نہیں۔

(ب) اس میں نواب ضیاالدین احمد خاں کی لکھی ہوئی تقریظ شامل نہیں۔

(ج) خاتمۃ الطبع کی عبارت یہ ہے۔

"بخدمتِ اربابِ سخن عرض کرتا ہے۔ امیدوارِ رحمت و غفران محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوانِ بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن لسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیّر و تبدل ہوا۔ اس لیے جناب مجمعِ لُطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جنابِ مصنّف کی ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحتِ تمام اور درستی کمال سے چھپایا امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوتِ سخن کی پائیں ہمہ تن کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ فقط"۔

پھر خواجہ طالب حسین طالب کے قطعۂ تاریخ اور مالکانِ مطبع کے دستخط اور مُہر پہ دیوان ختم ہوتا ہے۔ قطعۂ تاریخ یہ ہے:-

کیا ہی دیوان چھپا غالب کا ۔۔۔ دیکھ کر سب نے کہا خوب ہے یہ
بسکہ ہر ایک کو مرغوب ہوا ۔۔۔ ٹھہری تاریخ کہ مرغوب ہے یہ
۱۲۷۸

(د) اس ایڈیشن میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں یعنی ۱۸۰۲ اشعار۔ میں نے ابھی ۱۹۸۷ء میں اس کا عکسی ایڈیشن ایک وضاحتی پیش لفظ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

(۵)

(ا) اس ایڈیشن (پانچویں) کے سرورق کی عبارت یہ ہے۔

"العلم قوۃ
۱۲۸۰ ھ
دیوانِ غالب
مطبع مفیدِ خلائق آگرہ میں اہتمام سے منشی شیونارائن کے چھپا"

دیباچہ مثلِ سابق۔

(ب) تقریظ میں کوئی ردّ و بدل نہیں۔ تعدادِ اشعار "یک ہزار و ہفصد و نود و دو" بتائی گئی ہے۔ سالِ تصنیفِ تقریظ ۱۲۷۱ھ ہی ہے۔

(ج) خاتمۃ الطبع ندارد۔

(د) صحیح تعدادِ اشعار ۱۷۹۵ ہے۔

غالبؔ کی زندگی میں شایع ہونے والے یہ پانچوں ایڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان کی حالت اطمینان بخش ہے مگر بعض مقامات دیمک چاٹ گئی ہے اور بعض اوراق کے کچھ حصے ضائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے گزارش ہے کہ اگر کوئی صاحب میری دی ہوئی معلومات سے پورے طور پر مطمئن نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلوبہ معلومات میری دسترس سے باہر ہیں۔

●

توقیتِ غالبؔ

۱۷۵۰ء تقریباً — میرزا قوقان بیگ خان — غالبؔ کے دادا کی سمرقند سے ہندوستان میں آمد (چندے لاہور میں رہے، محمد شاہ (شاہ عالم کی شہزادگی) کے عہد میں دلّی پہنچے۔ شاہی ملازم پھر مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری۔ آگرہ میں قیام۔)

۵۹-۱۷۵۸ء — قتیلؔ کی ولادت شاہجہان آباد میں

۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) — (محمد) اسد اللہ (بیگ) خان (غالبؔ) کی آگرے میں ولادت
[قوقان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبد اللہ بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوا۔ یہ اسد اللہ بیگ خان (غالبؔ) کے والدین تھے]

۱۷۹۹ء (۴ مئی) — ٹیپو سلطان کی شہادت

۱۸۰۰-۱۷۹۹ء — یوسف علی بیگ خان (غالبؔ کے چھوٹے بھائی) کی ولادت

۱۸۰۲ء — سالِ ولادت لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف (برادرِ غالبؔ)

۱۸۰۲ء میرزا عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال ہے

کافی بود مشاہدہ، شاہد خرد زمیت
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار (غالب)

اسداللہ بیگ خان اور ان کے خاندان کا نصر اللہ بیگ خان (عبداللہ بیگ خان کے برادرِ خُرد) کی سرپرستی میں آنا (نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعدار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو مشاہرے پر ۴۰۰ سواروں کے رسالدار مقرر ہو گئے)

۱۸۰۳ء (۱۸ اکتوبر) آگرہ پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸۰۶ء (؟ اپریل) نصر اللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر جانے سے زخمی ہونا اور انتقال (نواب احمد بخش خان والیِ فیروز پور جھرکا لوہارو کی ہمشیرہ نصر اللہ بیگ خان کے عقدِ نکاح میں تھی)

۱۸۰۶ء (۴ مئی) احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خان کے پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا شقہ)

(اس وظیفے میں نصر اللہ بیگ خان کی والدہ، تین بہنیں، اسد اللہ بیگ خان اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی بیگ خان حصہ دار تھے)

۱۸۰۶ء (۷ جون) وظیفہ کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی۔ (دوسرا شقہ)
غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ (اس شقہ کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ کا حصہ دار قرار دیا گیا تھا)

۱۸۰۶ء (۲۸ نومبر) جلال الدین شاہ عالم ثانی کا انتقال
معین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی

۱۸۰۷-۸ء — شعر گوئی کا آغاز - اسد تخلص

تقریباً — ایک اور شاعر میر امانی اسد تھے۔ چوں کہ لوگ اس کا کلام ان سے منسوب کرنے لگے تھے، انھوں نے اسد تخلص ترک کر کے (تقریباً ۱۸۱۶ء میں) اس کی جگہ غالب کر دیا۔ تاہم کبھی کبھی اسد تخلص بھی روا رکھا

۱۸۰۹-۱۰ء — قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات

۱۸۱۰ء — اسد اللہ بیگ خان کی مولوی محمد معظم کے مکتب (آگرہ) میں تعلیم (بحوالہ عیار الشعرا از خوب چند ذکا، گلستانِ بے خزاں از قطب الدین باطن۔ بعد میں حالی وغیرہ)

۱۸۱۰ء (۱۹ اگست) — الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے دلی میں نکاح (الٰہی بخش خان، نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی۔ معروف کا نامکمل دیوان چھپ چکا ہے، مکمل مخطوطہ میرے کتب خانے میں موجود ہے)

۱۸۱۰ء (۲۰ ستمبر) — میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات

۱۸۱۲-۱۳ء — غالب کی دلی میں آمد اور مستقل سکونت

۱۸۱۴ء ۱۹ اگست تا ۸ جولائی ۱۸۱۷ء — کسی بھی سال میں مرزا یوسف کی شادی (یقینی دن، تاریخ اور مہینہ - دو شنبہ (سہ شنبہ؟) ۲۲ شعبان

۱۸۱۵-۱۶ء

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ

غالب کی پہلی مہر (۱۲۳۱ھ) غالب کی عمر ۱۹-۲۰ برس کی تھی یعنی ان کے عیش و نشاط کا زمانہ تھا۔

غالب کی دوسری مہر

اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ

(یہ دونوں مہریں ایک ہی سال میں بنوائی گئیں)

اس مہر کی بنا حضرت علیؑ کا لقب ہے اور یہ بطورِ سجع ہے۔ بعد میں تبدیلِ تخلص

کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار پایا۔

۱۸۱۶ء	غالب تخلص کا باقاعدہ استعمال
۱۸۱۷ء (۱۹ مئی)	انشاء کی لکھنؤ میں وفات
۱۸۲۲-۲۳ء	غالب کی تیسری مہر — محمد اسد اللہ خاں ۱۲۳۸ھ

یہ مہر انیسویں صدی کے ربع اول میں دلی کے علماء میں ایک بہت بڑے مذہبی مباحثے سے پیدا شدہ رجحان کی دین ہے، جسمیں فضل حق خیر آبادی کے اصرار پر غالب کو بھی ایک مثنوی کہنی پڑی تھی۔

۱۸۲۴-۲۵ء	مصحفی کی لکھنؤ میں وفات
۱۸۲۵ء	خواجہ حاجی کا انتقال (انتقال شاید ۱۸۲۵ء کے شروع میں ہوا ہوگا۔ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کی پنشن کی درخواست میں غالب نے لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا انتقال تین برس ہوئے جذام کے مرض سے ہوا)
۱۸۲۵ء مئی۔جون	فیروزپور جھرکا کا سفر۔ نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں بسلسلۂ حقِ پنشن۔ یہ بات جنرل اختر لونی کے انتقال (۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء) سے کچھ پہلے کی ہے۔
۱۸۲۵ء (نومبر دسمبر)	میرزا یوسف علی (بیگ) خاں کی شدید بیماری، دیوانگی کا آغاز
۱۸۲۵-۲۶ء	قرض خواہوں کے تقاضوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا
ایضاً	نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کا سفر مقصد سر چارلس مٹکاف سے ملنا تھا۔
ایضاً	واپسی پر ایک لمبے عرصے تک فیروزپور جھرکا میں نواب احمد بخش خاں کے ساتھ قیام
۱۸۲۶ء	الٰہی بخش خاں معروف (غالب کے خسر) کا انتقال

۱۸۲۶ء (۱۳ اکتوبر) نواب احمد بخش خان کی فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی حکومت سے دستبرداری (نواب شمس الدین احمد خان والیِ ریاست)

۱۸۲۶ء (دسمبر) (ا) سفرِ کلکتہ کا آغاز۔ قرض خواہوں کے ڈر سے دلی نہ گئے اس لیے فیروز پور جھرکا ہی سے سفرِ کلکتہ شروع ہو گیا

(ب) چونکہ نواب احمد بخش خاں نے غالب کو سر چارلس مٹکاف سے نہ ملایا اس لیے غالب مایوس ہو گئے۔ پھر گورنر جنرل کے ورودِ (کانپور وغیرہ) کی خبر پھیلی۔ غالب نے سوچا کہ کانپور چلا جائے۔ وہاں سر چارلس مٹکاف بھی ضرور جائیں گے، اس لیے واپسی پر اُن کی معیت میں اُن سے مل لوں گا۔ چنانچہ اس ارادے سے فرخ آباد اور کانپور کی طرف روانہ ہوئے مگر کانپور میں سخت بیمار ہو گئے اور وہاں سے خاطر خواہ علاج نہ ہونے پر پالکی میں لکھنؤ چلے آئے اور وہاں پانچ مہینے سے اوپر رہے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا راس نہ آئی، یہاں سے باندہ گئے اور لگ بھگ چھ مہینے نواب باندہ کے مکان پر رہے اور شفا پائی

(ج) باندہ سے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے کا سفر جاری۔ دو تین ملازم ساتھ تھے

۱۸۲۷ء (۱ اکتوبر) نواب احمد بخش خان کا انتقال۔ غالب کو یہ خبر سفرِ کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی

۱۸۲۷-۲۸ء فارسی کی شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز (اس سے پہلے کا سرمایۂ فارسی شعر ناقابلِ اعتناء اور مقدار میں بہت کم ہے۔ گلِ رعنا میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۴ھ) تک ان کے پاس ۲۷ غزلوں سے زیادہ فارسی کلام نہ تھا۔ اور وہ بھی اسی سفرِ کلکتہ کے دوران کہا گیا تھا۔ غالب کے قدیم ترین خطی نسخے میں بھی اردو کا تو مکمل مردّف دیوان ہے مگر فارسی کی صرف ۱۲ رباعیاں

ہیں۔

۱۸۲۸ء (۲۱ فروری) کلکتہ میں ورود۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت بازار) میں گرو تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا

۱۸۲۸ء (۲۸ اپریل) پنشن کے مقدمے کا آغاز
(سرکاری درباروں میں کرسی نشینی کا آغاز۔ گلِ رعنا کی ترتیب و تدوین۔ یہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا)

ایضاً پنشن کی درخواست میں مذکور ہے کہ "میرا نام محمد اسداللہ خاں ہے" (اس کے سامنے وہ خط بنام تفتہ بھی دیکھیے جس میں غالب نے لکھا ہے کہ وہ اب "محمد" کا لفظِ مبارک اپنے نام کے ساتھ اس لیے نہیں لگاتے کہ لوگوں نے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے بھی موقوف کیا)

ایضاً غالب نے درخواست میں لکھا کہ آج ان پر بیس ہزار روپیہ قرض ہے

۱۸۲۹ء (۲۹ نومبر) کوئی تین برس کی غیر حاضری کے بعد دلی واپس۔ سفرِ کلکتہ ختم

۱۸۳۰ء راجا رام موہن رائے کا سفرِ انگلستان

" (۱۶ اگست) نظیر اکبرآبادی کی وفات

۱۸۳۱ء (۲۷ جنوری) مقدمۂ پنشن خارج
(اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا)

۱۸۳۳ء (۱۶ اپریل) دیوانِ متداول (اردو) کی تاریخِ ترتیب

۱۸۳۴ء (تقریباً) شیفتہ کی غالب سے پہلے پہل جان پہچان

ایضاً پہلی بار ہندوستانی مجسٹریٹوں کا تقرر، انگریزی عہد میں

۱۸۳۴ء (۸ اکتوبر) کریم خاں داروغۂ شکار شمس الدین خاں کی ایما   میواتی کے ساتھ دلی میں انگریز ریذ

کے ایجنٹ ولیم فریزر کے قتل کیلئے دلّی میں آمد۔ تین مہینے دلّی رہا مگر ناکام لوٹا۔ پھر دلّی واپس آیا۔

۱۸۳۵ء (۲۲ مارچ)	ولیم فریزر کا قتل۔ کریم خان داروغہ شکار نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری
۱۸۳۵ء (۱۸ اپریل)	نواب شمس الدین احمد خان کی الزام قتل میں گرفتاری
۱۸۳۵ء (۲۶ اگست)	کریم خان کو بجرم قتل پھانسی کی سزا
۱۸۳۵ء (۸ اکتوبر)	نواب شمس الدین احمد خان کو بالزام اعانت مجرمانہ پھانسی
	(اس پر فیروزپور جھرکا کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی پنشن، ساڑھے سات سو روپے سالانہ، ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی)
۱۸۳۷ء	شمالی ہند میں قحط
۱۸۳۷ء (۲۹ ستمبر)	معین الدین اکبر شاہ ثانی کا انتقال
۱۸۳۷ء (۳۰ ستمبر)	سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی
۱۸۳۷ء (۲۰ نومبر)	راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم
۱۸۳۸ء	ناسخ کا لکھنؤ میں انتقال
۱۸۳۸ء	شاہ نصیر کا حیدرآباد میں انتقال
۱۸۳۹ء	مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال
۱۸۴۰ء (؟)	غالب کی والدہ کی علالت اور انتقال
	(ایک فارسی تحریر کے پیشِ نظر وہ ۳۰ جنوری ۱۸۴۰ء تک زندہ تھیں)
ایضاً	دلّی کالج میں مدرسِ فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالب کا انکار
۱۸۴۱ء (اگست)	غالب کی گھر پہ جوا خانہ کے قیام میں گرفتاری
	(عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدمِ ادائیِ جرمانہ کی صورت میں چار مہینہ قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا)

۱۸۴۱ء (اکتوبر) — دیوانِ اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سید الاخبار، دہلی۔ اگرچہ دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب ہو چکا تھا)

۱۸۴۲-۴۴ء — بعہدِ لارڈ ایلن برا گورنر جنرل، خلعتِ ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا غالب کو اعزاز

۱۸۴۴ء — میر نظام الدین ممنون کا دلی میں انتقال

۱۸۴۵ء — دیوانِ فارسی (میخانۂ آرزو سرانجام) کا پہلا ایڈیشن (مطبع دار السلام دلی) ۔ دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا

۱۸۴۵-۴۶ء — سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی

۱۸۴۶ء (؟) — غالب کا پہلا اردو خط (بنام تفتہ)

ایضاً (۱۷ جنوری) — آتش کا لکھنؤ میں انتقال

۱۸۴۷ء — زین العابدین خان عارف کے بڑے بیٹے باقر علی خان کی پیدائش

۱۸۴۷ء (مئی) — دیوانِ اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع دار السلام دلی)

۱۸۴۷ء (۱۷ جون) — گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب کی دوبارہ گرفتاری (فیصلے میں چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ مشقت غالباً پچاس روپے ادا کر کے معاف ہو گئی۔ وہ صرف تین مہینے قید میں رہے اس کے بعد رہائی ہو گئی)

۱۸۴۸ء (۹ مارچ) — غالب کا پہلا اردو خط (بنام نبی بخش حقیر تاریخ کے ساتھ)

۱۸۴۸-۴۹ء — سکھوں اور انگریزوں کی دوسری لڑائی

۱۸۴۹ء (اگست) — پنج آہنگ (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی)

۱۸۵۰ء — زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خان کی پیدائش

۱۸۵۰ء (جولائی) — تیموری خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) لکھنے پر مقرر، خلعت اور خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ

(تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئی)

۱۸۵۰-۵۱ء حافظ عبدالرحمٰن خان (حافظ جیو) احسان دہلوی کا دلّی میں انتقال

ایضاً غالب کی چوتھی مہر

نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں
بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷ھ

غالب کو یہ خطاب بہادر
شاہ ظفر نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو دیا۔ جو ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کے مطابق ہے۔ مہر ۱۲۶۷ھ میں بنوائی گئی۔ جو ۶ نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔

۱۸۵۲ء (اپریل) زین العابدین خان عارف (امراؤ بیگم کے بھانجے) کی وفات
(عارف کی وفات کے بعد ان کے دونوں لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا) قبر جوارِ غالب کے قریب کونے میں ہے۔

۱۸۵۲ء (۱۴ مئی) مومن کا دلّی میں انتقال۔

۱۸۵۲-۵۳ء غالب کی پانچویں مہر

یا اسد اللہ الغالب
۱۲۶۹ھ

غالب حضرت علیؓ کو مشکل کشا مانتے تھے۔ شاید یہ مہر ان کے سقیم حالات کی نشاندہی کرتی ہے

۱۸۵۳ء (اپریل) پنج آہنگ کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دار السلام، دلّی)

۱۸۵۳ء بمبئی سے تھانہ (مہاراشٹر) تک پہلی ریلوے لائن

۱۸۵۳ء کلکتہ سے آگرہ تک ٹیلی گراف

۱۸۵۴ء حالی پہلی مرتبہ دلّی آئے۔ بعمر ۱۷-۱۸ برس
ڈیڑھ برس کے بعد اواخر ۱۸۵۵ء میں واپس پانی پت
سال بھر حصار میں ملازمت کی

۱۸۵۴ء (۱۵ نومبر) شیخ محمد ابراہیم ذوق (استادِ ظفر کا انتقال)

۱۸۵۴-۵۵ء غالب استادِ ظفر

۵۵-۱۸۵۴ء مہرِ نیم روز کی طباعت و اشاعت (فخر المطابع، دلّی)
(یہ اسی سال میں کم از کم تین بار چھپی۔ یہ سب ایڈیشن جو پہلا ایڈیشن ہی کہلاتے ہیں۔ میرے کتب خانے میں موجود ہیں)

۱۸۵۶ء قادر نامہ کی اشاعتِ اوّل (مطبع سلطانی، لال قلعہ دہلی)
(یہ نظم غالب نے عارف کے دونوں بچّوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے کہی تھی)

۱۸۵۶ء الحاقِ اودھ

۱۸۵۶ء (۱۰ جولائی) غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ ظفر) کا انتقال

۱۸۵۷ء (۲۸ جنوری) غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک پر والیِ رام پور نواب محمد یوسف علی خاں کی خدمت میں قصیدہ بھیجا

۱۸۵۷ء (۵ فروری) غالب کا تقرر بطور استادِ نواب یوسف علی خان، ناظم والیِ رام پور

۱۸۵۷ء (مارچ۔ اپریل) غالب کے رازدارانہ خطوط بنام والیِ رام پور
قوی گمان ہے کہ یہ سیاسی امور پر مشتمل تھے۔ اس لیے غالب کی ہدایت پر یہ خطوط ضائع کر دیے گئے

۱۸۵۷ء (۱۰ مئی) سنہ اٹھارہ سو ستّاون کے ہنگامے (غدر) کا میرٹھ میں آغاز

۱۸۵۷ء (۱۱ مئی) دیسی فوج (تلنگوں) کا دلّی میں داخلہ: انگریزی تسلّط کا خاتمہ، دیسی اقتدار کا قیام؛ غالب کی قلعہ کی تنخواہ اور انگریزی پنشن بند

۱۸۵۷ء (۲۰ ستمبر) انگریزوں کی فتح اور دلّی پر دوبارہ قبضہ

۱۸۵۷ء (ستمبر) غدر کے بعد دلّی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران امام بخش صہبائی انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے

۱۸۵۷ء (۱۸-۱۹ اکتوبر) میرزا یوسف علی (بیگ) خان (برادرِ غالب) کی وفات (وہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے، اگرچہ غالب نے مصلحتاً لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی)

۱۸۵۸ء (نومبر) دستنبو کی اشاعتِ اوّل (مطبع سفید خلائق آگرہ)

۱۸۵۹ء سکّہ کا الزام۔ خط بنام حسین مرزا، نوشتہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء۔ لیکن گوری شنکر مخبر نے سکّے کی رپورٹ (منسوب بہ غالب) ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریزوں کو پہنچا دی تھی

۱۸۵۹ء (۱۰ جولائی) والیِ رام پور سے مستقل وظیفے کی درخواست (اور اسی) مہینے سے سو روپے مہینہ بطورِ وظیفہ مقرّر

۱۸۶۰ء (جنوری) گورنر جنرل کی یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دلّی میں آمد۔ غالب ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ جواب ملا کہ "فرصت نہیں" اور کہ "تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے"

حقیقت یہ تھی کہ یہ سکّہ حافظ ویران شاگرد ذوق کا کہا ہوا تھا جو صادق الاخبار کے ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا

۱۸۶۰ء (۱۹ جنوری) رام پور کا پہلا سفر۔ ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے۔

۱۸۶۰ء (۲۴ مارچ) رام پور سے واپسی۔ (۱۷ مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے تھے)

۱۸۶۰ء (مئی) انگریزی پنشن کا دوبارہ اجرا۔ (تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوا)

۱۸۶۱ء (۲ جولائی) دیوانِ اردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی، دلّی)

۱۸۶۱ء (۱۱ اگست) مولانا فضل حق خیرآبادی کا جزیرہ انڈمان میں انتقال

۱۸۶۱-۶۲ء غالب کی چھوٹی مہر [غالب ۱۲۷۸] یہاں سے غالب کی زندگی کا انتہائی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مختصر عَلَم ان کی انا کا نقطۂ عروج ہے۔ سات سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ یہ ان کی آخری مہر

تھی گویا انکی انا کا مظاہرہ ان کے انتقال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا

۱۸۶۲ء قاطع برہان کی طبع اول (مطبع نولکشور، لکھنؤ)

۱۸۶۲ء (مارچ) انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجرا۔

۱۸۶۲ء (جون/جولائی) دیوانِ اردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی، کانپور)

۱۸۶۲ء (یکم اکتوبر) لاڈو بیگم بیوہ مرزا یوسف کی حکومت سے درخواست، گزارے کے لیے

۱۸۶۲ء دیوانِ اردو کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفیدِ خلائق آگرہ)

۱۸۶۳ء (جولائی) یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۲۰ روپے مہینہ خیراتی پنشن بنام لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف مرحوم، جاری

۱۸۶۳ء (مئی/جون) دیوانِ فارسی (کلیاتِ نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نولکشور، لکھنؤ)

۱۸۶۴ء مثنوی ابرِ گہربار کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)

(یہ مثنوی کلیاتِ نظم میں شامل تھی لیکن اب الگ سے شائع ہوئی)

۱۸۶۴ء قاطع برہان کے جواب میں محرقِ قاطعِ برہان مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی، دلی)

۱۸۶۴ء قادر نامہ کی دوسری اشاعت (مجلس پریس، دلی)

۱۸۶۴ء محرقِ قاطعِ برہان از سید سعادت علی کی اشاعت۔

۱۸۶۴ء لطائفِ غیبی (اگرچہ نام میاں داد خاں سیاح کا ہے مگر اس کے اصل مصنف غالب ہی ہیں)

۱۸۶۵ء دافعِ ہذیان مصنفہ سید محمد نجف علی جھجری کی اشاعت

۱۸۶۵ء سوالاتِ عبدالکریم از عبدالکریم کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)

(دوسرے کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ بھی غالب کی اپنی تصنیف ہے)

۱۸۶۵ء ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کی اشاعت

۱۸۶۵ء — غالب نے حکومت سے تین مطالبے کیے کہ انھیں شاعرِ دربار مقرر کیا جائے پہلے سے اونچی جگہ ملے اور دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر میں غالب کا رویّہ کیا تھا۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکّہ منسوب ہے۔ سب درخواستیں ردّ ہو گئیں۔
غالب پر سکّہ کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا۔

۱۸۶۵ء (۲۱ اپریل) — نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کا انتقال، نواب کلب علی خان کی جانشینی

۱۸۶۵ء (اگست) — غالب کے رسالے نامۂ غالب بجوابِ ساطعِ برہان کی اشاعت (مطبع محمدی، دلّی)

۱۸۶۵ء (۷ اکتوبر) — میرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر
۱۲ اکتوبر کو رام پور پہنچے

۱۸۶۵ء — دستنبو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی)

۱۸۶۵ء — برطانوی ہند کا یورپ کے ساتھ ٹیلی گراف کے ذریعہ براہِ راست رابطہ

۱۸۶۵ء (دسمبر) — قاطعِ برہان کی طبعِ ثانی بعنوان درفشِ کاویانی کی اشاعت (اکمل المطابع دلّی)

۱۸۶۵ء (دسمبر) — رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی
(۲۸ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ کو دلّی پہنچے)

۱۸۶۶ء — قاطعِ برہان کے جواب میں مؤیّدِ برہان مصنّفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب، کلکتہ)

۱۸۶۶ء — قاطعِ برہان کے جواب میں قاطع القاطع مصنّفہ امین الدین امین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی دہلی)

۱۸۶۷ء (؟) — دعائے صباح۔ فارسی منظوم ترجمہ (مطبع نولکشور لکھنؤ)

(اس کا آج تک ایک ہی مطبوعہ نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے کتب خانے میں ہے)

۱۸۶۷ء — تیغِ تیز کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی)
(غالب نے یہ مختصر رسالہ مؤیدِ برہان کے جواب میں لکھا تھا)

۱۸۶۷ء (فروری) — نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب کی اشاعت (مطبع سراجی، دلی)
پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلمبند کیے

۱۸۶۷ء (۱۱ اپریل) — ہنگامۂ دل آشوب (۱) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ)
(قاطعِ برہان کے مناقشے کے سلسلے کے منظومات)

۱۸۶۷ء (اگست) — سبدِ چین کی اشاعت (مطبع محمدی، دلی)

۱۸۶۷ء (۲۵ ستمبر) — ہنگامۂ دل آشوب (۲) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ)

۱۸۶۷ء (۲ دسمبر) — مولوی امین الدین دہلوی مصنفِ ساطعِ برہان کے خلاف مقدمہ ازالۂ حیثیتِ عرفی

۱۸۶۸ء (جنوری) — کلیاتِ نثرِ فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع نولکشور، لکھنؤ)
(اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں پنج آہنگ، مہرِ نیم روز، دستنبو شامل ہیں)

۱۸۶۸ء (۲۳ مارچ) — مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری، راضی نامہ

۱۸۶۸ء (۱۶ جولائی) — مفتی محمد صدر الدین آزردہ کا دلی میں انتقال

۱۸۶۸ء (۲۷ اکتوبر) — عودِ ہندی، مجموعۂ مکاتیبِ غالب کی پہلی اشاعت (مطبع مجتبائی، میرٹھ)

۱۸۶۹ء (۱۵ فروری) — غالب کی وفات۔ بستی نظام الدین خاندانِ لوہارو کی ہٹوارے میں تدفین۔

(اگرچہ بہت دنوں سے مختلف امراض کا شکار تھے، لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ۱۴ فروری دوپہر کو بے ہوش ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔ آخری وظیفہ بابت جنوری ۱۸۶۹ء منجانب نواب، رام پور، غالب کی وفات سے صرف ایک گھنٹہ پہلے موصول ہوا تھا)

۱۸۶۹ء (مارچ) اردوئے معلیٰ (مجموعۂ مکاتیبِ اردو) کی پہلی اشاعت (اکمل المطابع دلّی)

۱۸۶۹ء (ستمبر-اکتوبر) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال

۱۸۶۹ء شمشیرِ تیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع نبوی، کلکتہ)

(یہ قاطعِ برہان کے سلسلے کی آخری کتاب، غالب کی تصنیف تیغ تیز کے جواب میں ہے جو میرزا کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اگرچہ اسکی طباعت ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی)

۱۸۷۰ء (۴ فروری) بیگمِ غالب امراؤ بیگم کا انتقال
(مزارِ غالب کی شرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون ہیں)

۱۸۷۴ء حکیم آغا جان عیش کا دلّی میں انتقال

۱۸۷۶ء (۲۵ مئی) باقر علی خان (فرزندِ اکبر زین العابدین خان عارف) کا انتقال فارسی میں تخلص باقر تھا اور اردو میں کامل۔ مدفون سلطان جی

میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی قاسم جانیوں کی ہڑ واڑہ میں ہے)

۱۸۸۰ء (۷ستمبر) حسین علی خان، زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے کا انتقال، اردو میں شاداں تخلص کرتے تھے، فارسی میں خیالی:

۱۹۴۵ء (۱۰مئی) معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم زوجہ باقر علی خاں کامل (فرزندِ اکبر زین العابدین خان عارف) کا انتقال
(بگا بیگم ۱۲ سال کی عمر میں کامل کی دلہن بن کر مرزا غالب کے گھر میں آئیں۔ ۲۴ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ اور ۶۹ سال بیوگی کے عالم میں گزار کر بعمر ۹۳ سال فوت ہوئیں۔ فخرالدین علی احمد مرحوم سابق صدر جمہوریۂ ہند ان کے نواسے تھے)

دیوانِ غالبؔ (کامل)

تاریخی ترتیب سے

۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۲ء (؟)

متفرّق

عمدۂ منتخبہ

(تذکرۂ سرؔور)

۱۸۰۰-۱ء تا ۱۸۳۱-۳۲ء

عیار الشعراء

(تذکرۂ خوب چند ذکاؔ)

۱۷۹۸-۹۹ء تا ۱۸۳۲-۳۳ء

مثنوی

• تقریباً ۱۸۰۷ء

ایک دن، مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے، دل، سر رشتۂ آزادگی [۱]

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا "اے دل! ہوائے دلبراں
بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں

پیچ میں ان کے نہ آنا، زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار

گورے پنڈے پر نہ کر، ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ، ڈورے ڈال کر

اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ

سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے
قہر ہے، دل ان سے الجھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر، اڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کا اوّلیں منظوم کلام'، ص ۲۶

قطعات

تقریباً ۱۸۱۰ء

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں، جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروحِ پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ "او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھِل کھِلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا: میں صید ہوں، اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے
اُسی کے زُلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بہ چشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر، ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اردو اشعار کا زمانۂ فکر'، ص ۵۴ تا ۸۴

تقریباً ۱۸۱۰ء

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا: "آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب؟"[1]

بال و پر دو چار دکھلا کر، کہا صیاد نے
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

غزلیات

۱۸۱۲ء

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو، ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر[2]

۱۸۱۲ء

یاد آیا جو وہ کہنا کہ "نہیں، واہ غلط"
کی، تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ، غلط[3]

۱۸۱۲ء

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعل بیش بہا، کاروانِ اشک[4]

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اردو اشعار کا زمانہ' فکر، ص ۴۶ تا ۷۸
۲۔۳۔۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ' میں ذکرِ غالب' ص ۳۳

ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدّعا
طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ، زبانِ اشک

میں وادیِ طلب میں ہوا جملہ تن عرق
از بسکہ صرفِ قطرہ زنی تھا بسانِ اشک

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار
مژگاں کو دوں فشارِ پئے امتحانِ اشک

دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار
باغِ بخوں تپیدن، و آبِ روانِ اشک

سیلِ بنائے ہستیِ شبنم ہے، آفتاب
چھوڑے نہ چشم میں، تپشِ دل، نشانِ اشک

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں، اسدؔ
ہے بر سرِ مژہ نگراں، دیدبانِ اشک

● تقریباً ۱۸۱۲ء

نسخۂ سوزشِ دل، درخورِ عناب نہیں
سرِ سودا زدہ، آتشکدہ تاب نہیں[۱]

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانہ' فکر، ص ۵۱

ہمّت و حوصلۂ شورشِ شبنم معلوم
قلزمِ اشک، بہ دیدۂ خوناب نہیں

پرسشِ عشق سے ہے اُنکو فراغت مقصود
ہدیۂ پارۂ دل، نازشِ جلباب نہیں

ہمّت و شوقِ طلب گاریِ مقصود کہاں؟
برق، خرمن زنِ بیتابیِ سیماب نہیں

گلشنِ ہستیِ عالم، ہے دبستانِ نشاط
نقشِ گل، رونقِ بے مشقیِ طلّاب نہیں

۱۸۱۲ء

آنسو کہوں کہ، آہ، سوارِ ہوا کہوں؟
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں[1]

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا م
گر ایک ادا ہو، تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل م
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش م
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں!

ظالم، مرے گماں سے، مجھے منفعل نہ چاہ م
ہے ہے! خدانکردہ، تجھے بے وفا کہوں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالب' ص ۳۴ تا ۳۶

اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدّعا رسا
زغتہ کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں

مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اُسے
اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال
مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

طرزِ آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے
آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں

غالبؔ، ہے رتبہ فہمِ تصوّر سے کچھ پرے
ہے عجزِ بندگی، کہ علی کو خدا کہوں

● ۱۸۱۲ء

مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں — شمع ساں، میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں[۱]
ہو وے ہے، جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ سے، میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سُبک رَو کے، نہ رہنے سے رہو — کہ بہ یک جنبشِ لب، مثلِ صدا، جاتا ہوں

● ۱۸۱۲ء

دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنّا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو[۲]

● ۱۸۱۲ء

شمشیرِ صاف یار، جو زہراب دادہ ہو — وہ خطِّ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو[۳]

۱، ۲، اور ۳ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "اعجازِ منتخبہ میں ذکرِ غالب" ص ۳۳-۳۴

● ۱۸۱۲ء

ہنستے ہیں، دیکھ دیکھ کے، سب، ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے[1]

● ۱۸۱۲ء

دیکھ وہ برقِ تبسّم، بس کہ، دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوّارۂ سیماب ہے[2]
کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

● ۱۸۱۲ء

اک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے[3]
پروانے کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے، اسدؔ
ہر رات، شمع، شام سے لے تا سحر جلے؟

● ۱۸۱۲ء

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے[4]

● ۱۸۱۲ء

صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچہ گُل سوئے آشیاں پھر جائے[5]

● ۱۸۱۲ء

بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو؟ جب ادبار آتا ہے
تو یوسف سا حسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے[6]

۱، ۲، ۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالب' ص ۳۴ تا ۳۶

۴، ۵۔ .... ص ۴۰۔ یہ دو اشعار تذکرۂ عیار الشعراء، خوب چند ذکا کے سوائے کسی مطبوعہ / غیر مطبوعہ دیوان یا بیاض میں نہیں پائے جاتے۔

۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۵۰

تقریباً ۱۸۱۲ء

جو حدِّ تقویٰ ادا نہ ہووے تو اپنا مذہب بھی ہے، غالب
ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجیے، تو خوب کیجیے (۱)

تقریباً ۱۸۱۲ء

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے (۲)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانہ فکر' ص ۴۸/۴۹
(۲) خود غالب نے اس شعر کا زمانہ "ابتدائے فکرِ سخن" لکھا ہے۔ دیکھیے مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر۔ عودِ ہندی ص ۱۵۹۔ میرا دیا ہوا سال (۱۸۱۲ء) محض قیاس ہے۔

۱۸۱۳ء

تا

۱۸۱۶ء

نُسخۂ بھوپال

(بخطِّ غالبؔ)

۱۸۱۶ء

۱۸۱۶ء

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا! م
کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ م
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے م
سینۂ شمشیر سے باہر ہے، دم شمشیر کا

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے م
مدعا عنقا ہے، اپنے عالمِ تقریر کا

شوخیِ نیرنگ، صیدِ وحشتِ طاؤس ہے
دام، سبزے میں ہے، پروازِ چمن تسخیر کا

لذتِ ایجادِ ناز، افسونِ عرضِ ذوقِ قتل
نعل، آتش میں ہے تیغِ یار سے، نخچیر کا

خشت پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع
پُر ہوا ہے سیل سے، پیمانہ کس تعمیر کا!

وحشتِ خوابِ عدم، شورِ تماشا ہے، اسدؔ
جو مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

بس کہ ہوں، غالبؔ، اسیری میں بھی آتش زیرپا م
موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

۱۸۱۶ء

جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا
سُوَیدا، تا بلب، زنجیریِ دودِ سپند آیا

مہِ اختر فشاں کی، بہرِ استقبال، آنکھوں سے
تماشا، کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا

تغافل، بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی ہے
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل، پسند آیا

عدم، ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی
خرامِ ناز، برقِ خرمنِ سعیِ سپند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ م
مبارک باد اسدؔ، غم خوارِ جانِ دردمند آیا

۱۸۱۶ء

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا م
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے م
کشایش کو، ہمارا عقدۂ مشکل، پسند آیا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل م
کہ اندازِ بہ خوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا

سوادِ چشمِ بسمل، انتخابِ نقطۂ آرائی
خرامِ نازِ بے پروائیِ قاتل پسند آیا

روانیہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ، جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

اسد، ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

● ۱۶۱۸ء

خود آرا وحشتِ چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا
کہ موم، آئینۂ تمثال کو تعویذِ بازو تھا

بشیرینیِ خواب آلودہ مژگاں، نشترِ زنبور
خود آرائی سے، آئینہ، طلسمِ موم جادو تھا

نہیں ہے بازگشتِ سیل، غیر از جانبِ دریا
ہمیشہ دیدۂ گریاں کو، آبِ رفتہ در جو تھا

رہا نظارہ وقتِ بے نقابی آپ پر لرزاں
سرِشک آگیں مژہ سے، دست از جاں شستہ بر رو تھا

غمِ مجنوں، عزادارانِ لیلیٰ کا پرستش گر
تخمِ رنگِ سیہ، پیمانۂ ہر چشمِ آہو تھا

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا، ورنہ
اشارت فہم کو، ہر ناخنِ بریدہ، ابرو تھا

اسد، خاکِ درِ میخانہ اب سر پہ اڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے زانو زانو تھا

● ۱۶۱۸ء

دویدن کے کمیں، جوں ریشۂ زیرِ زمیں پایا
بگردِ سرمہ، اندازِ نگاہِ شرمگیں پایا

اُگی اک پنبۂ روزن سے تھی، چشمِ سفید آخر
حیا کو، انتظارِ جلوہ ریزی کے کمیں پایا

بہ حسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

پریشانی سے، مغزِ سر، ہوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

نفس، حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں
مگر یک دست و دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

اسد کو، پیچ تابِ طبعِ برق آہنگ مشکل سے
حصارِ شعلۂ جوّالہ میں عزلت گزیں پایا

● ۱۶۱۸ء

نزاکت، ہے فسونِ دعویٰ طاقت شکستن ہا
شرارِ سنگ، اندازِ چراغ از جسم خستن ہا

رسیدہ مستیِ چشمِ شوخ سے ہیں، جوہرِ مژگاں
شرار آسا، ز سنگِ سرمہ یکسر بارِ جستن ہا

ہوائے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بافی
کہ تھا آئینہ خود بے نقابِ زنگ بستن ہا

دلِ از اضطراب آسودہ، طاعت گاہِ داغ آیا
برنگِ شعلہ ہے، مُہرِ نماز، از پا نشستن ہا

تکلف عاقبت میں ہے دلا، بندِ قبا وا کر
نفس ہا بعدِ وصلِ دوست نادانِ گسستن ہا

اسد، ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن
یہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب، امیدِ رستن ہا

۱۸۱۶ء

لبانِ جوہرِ آئینہ، از ویرانیِ دل ہا
غبارِ کوچہ ہائے موج ہے، خاشاکِ ساحل ہا

نگہ کی ہم نے پیدا رشتۂ ربطِ علائق سے
ہوئے ہیں، پردہ ہائے چشمِ عبرت، جلوہ حائل ہا

نہیں ہے، باوجودِ ضعف، اسیرِ بے خودی آساں
رہِ خوابیدہ میں افگندنی ہے، طرحِ منزل ہا

عزیمی بہرِ تسکینِ ہوس درکار ہے، ورنہ
بوہم زر، گرہ میں باندھتے ہیں برقِ حاصل ہا

تماشا کردنی ہے، انتظار آبادِ حیرانی
نہیں غیر از نگہ، جوں نرگستاں، فرشِ محفل ہا

اسد، تارِ نفس ہے ناگزیرِ عقدہ پیرائی
بنوکِ ناخنِ شمشیر کیجے حلِ مشکل ہا

۱۸۱۶ء

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر، ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل، گردوں
نہ نکلے خشت، مثلِ استخواں، بیرونِ قالب ہا

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے، بنوکِ نیشِ عقرب ہا

کرے ہے حسنِ خوباں پردے میں مشاطگی اپنی
کرے ہے تہ بندیِ خط، سبزۂ خط در تہِ لب ہا

فنا کو عشق ہے، بے مقصداں، حیرت پرستاراں
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں، در پردہ یارب ہا

۱۸۱۶ء

برہنِ شرم ہے، با وصفِ شوخی، اہتمام اس کا
نگیں میں، جوں شرارِ سنگ، ناپیدا ہے نام اس کا

سرو کار، بہ تواضع، تا خمِ گیسو رسانیدن
لسانِ شانہ، زینت ریز ہے دستِ سلام اس کا

مسی آلودہ ہے مُہر نوازش نامہ، ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا

لڑاوے گر وہ بزمِ میکشی میں قہر و شفقت کو
بھرے پیمانۂ صد زندگانی، ایک جام اس کا

بامید نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل، لطفِ عام اس کا

اسد، سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اس کا، ابرِ بے پروا خرام اس کا

۱۸۱۶ء

یادِ روزے کہ نفس سلسلۂ یارب تھا
نالۂ دل، بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا

بہ تحیر کدۂ فرصتِ آرایشِ وصل
دلِ شب، آئنہ دارِ تپشِ کوکب تھا

بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار
دیدہ گو خوں ہو، تماشائے چمن مطلب تھا

جوہرِ فکر، پر افشانیِ نیرنگِ خیال
حسن آئینہ و آئینہ چمن مشرب تھا

پردۂ دردِ دل، آئینۂ صد رنگ نشاط
بخیۂ زخمِ جگر، خندۂ زیرِ لب تھا

نالہ ہا حاصلِ اندیشہ، کہ جوں کشتِ سپند
دلِ ناسوختہ، آتش کدۂ صد تب تھا

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے، اسبابِ تمنا سب تھا

آخرِ کار، گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

شوقِ سامان، فضولی ہے، وگرنہ غالب
ہم میں، سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا.

اسد! افسردگیِ آوارۂ کفر و دیں ہے
یادِ روزے کہ نفس در گرہِ "یارب" تھا

۱۸۱۶ء

شب کہ دل زخمیِ عرضِ دو جہاں تیر آیا
نالہ، بر عہدِ غلطِ شوخیِ تاثیر آیا

وسعتِ جیبِ جنونِ تپشِ دل مت پوچھ
محملِ دشت بہ دوشِ رمِ نخچیر آیا

ہے گرفتاریِ نیرنگِ تماشا ہستی
پرِ طاؤس سے، دل، پائے بہ زنجیر آیا

دید حیرت کش، و خورشید چراغانِ خیال
عرضِ شبنم سے، چمن، آئینہ تعمیر آیا

عشق ترسا بچہ و نازِ شہادت مت پوچھ
کہ کلہ گوشہ، بہ پروازِ پرِ تیر آیا

اے خوشا! ذوقِ تماشائے شہادت کہ اسد
بے تکلف بہ سجودِ خمِ شمشیر آیا

۱۸۱۶ء

سیر آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر، مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

سر خطِ بند ہوا، نامہ گنہ گاروں کا
خونِ بدہلہ سے لکھا نقش گرفتاروں کا

فردِ آئینہ میں بخشیں شکنِ خندۂ گل
دلِ آزردہ پسند، آئینہ رخساروں کا

داد خواہِ تپش، و مہرِ خموشی بر لب
کاغذِ سرمہ، ہے جامہ ترے بیماروں کا

وحشتِ نالہ، بہ واماندگیِ وحشت ہے
جرسِ قافلہ، یاں دل ہے گرانباروں کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے!
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

جلوہ مایوس نہیں دل نگرانی، غافل
چشمِ امید ہے، روزن تری دیواروں کا

اسد، اے ہرزہ درا، نالہ بہ غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

۱۸۱۶ء

طاؤس در رکاب ہے، ہر ذرہ آہ کا
یارب، نفس، غبار ہے کس جلوہ گاہ کا؟

عزلت گزینِ بزم ہیں، واماندگانِ دید
مینائے مے ہے، آبلہ پائے نگاہ کا

ہر گام، آبلے سے ہے، دل، در تہِ قدم
کیا بیم اہلِ درد کو سختیِ راہ کا

جیبِ نیازِ عشق، نشاں دارِ ناز ہے
آئینہ ہوں، شکستنِ طرفِ کلاہ کا

غافل بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں م
بے شانۂ صبا نہیں، طرۂ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ م
صیدِ ز دام جستہ ہے، اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے م
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے ۔۔۔ پُرگُل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں، در ہوائے یک نگہِ گرم ہے، اسدؔ ۔۔۔ پروانہ، ہے وکیل ترے داد خواہ کا

۱۸۱۶ء

یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار، باغ کا ۔۔۔ یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے، کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟ ۔۔۔ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے، نشۂ فکرِ سخن مجھے ۔۔۔ تریاکیِ قدیم ہوں، دُودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے ۔۔۔ پر کیا کریں؟ کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں، موجِ نگہ، غبار ۔۔۔ یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا
باغِ شگفتہ، تیرا بساطِ نشاطِ دل ۔۔۔ ابرِ بہار، خمکدہ کس کے دماغ کا؟
جوشِ بہار، کلفتِ نظّارہ ہے، اسدؔ ۔۔۔ ہے، ابر، پنبہ روزنِ دیوارِ باغ کا

۱۸۱۶ء

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری، انتظار اپنا ۔۔۔ کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا ۔۔۔ چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا
اسیرِ بے زباں ہوں، کاشکے! صیادِ بے پروا ۔۔۔ بدامِ جوہرِ آئینہ، ہو جاوے شکار اپنا
مگر ہو مانعِ دامن کشی، ذوقِ خود آرائی ۔۔۔ ہوا ہے نقش بندِ آئینہ، سنگِ مزار اپنا
دریغ! اے ناتوانی، ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے ۔۔۔ طلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہدِ استوار اپنا
اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بیتابی ۔۔۔ نیازِ گردشِ پیمانۂ مے، روزگار اپنا
اسدؔ، ہم وہ جنوں جولاں، گدائے بے سر و پا ہیں ۔۔۔ کہ ہے، سر پنجۂ مژگانِ آہو، پشت خار اپنا

● ۱۸۱۶ء

بسکہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاکِ موجِ سیل، تا پیراہنِ دیوانہ تھا

داغِ مہرِ ضبطِ بے جا، مستیِ سعیِ سپند
دودِ مجمر، لالہ ساں، دُردِ تہِ پیمانہ تھا

وصل میں بختِ سیہ نے سنبلستاں گل کیا
رنگِ شب، تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا

شب، تری تاثیرِ سحرِ شعلۂ آوازہ سے
تارِ شمع، آہنگِ مضرابِ پرِ پروانہ تھا

موسمِ گل میں مےِ گلگوں حلالِ مے کشاں
عقدِ وصلِ دخترِ رز، انگورہ کا ہر دانہ تھا

انتظارِ جلوۂ کاکل میں ہر شمشادِ باغ
سورتِ مژگانِ عاشق، صرفِ عرضِ شانہ تھا

حیرت، اپنے نالۂ بیدار سے، غفلت بنی
راہِ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا

کو بوقتِ قتل حقِ آشنائی، اے نگاہ!
خنجرِ زہراب دادہ، سبزۂ بیگانہ تھا

جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا، اسد
ورنہ بسمل کا تڑپنا، لغزشِ مستانہ تھا

● ۱۸۱۶ء

رات، دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
رنگِ روئے شمع، برقِ خرمنِ پروانہ تھا

شب کہ تھی کیفیتِ محفل بیادِ روئے یار
ہر نظر میں، داغِ مے، خالِ لبِ پیمانہ تھا

شب کہ باندھا خواب میں آنے کا، قاتل نے رجاج
وہ فسونِ وعدہ میرے واسطے افسانہ تھا

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا
تو کہے، صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

دیکھ اُس کے ساعدِ سیمین و دستِ پُرنگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع، گل پروانہ تھا

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب، ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

اے اسد، رویا جو دشتِ غم میں، میں حیرت زدہ
آئینہ خانہ زسیلِ اشک، ہر ویرانہ تھا

● ۱۸۱۶ء

پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا م بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
جہاں مٹ جائے سعیِ دید، خضر آبادِ آسائش بجیبِ ہر نگہ پنہاں ہے، حاصل رہنمائی کا
بہ عجز آبادِ وہمِ مدعا تسلیم شوخی ہے تغافل نہ کر مغرورِ تمکیں آزمائی کا
زکوٰۃِ حسن دے، اے جلوۂ بینش، کہ مہر آسا م چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر م رہا، مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی م عدم تک، بے وفا، چرچا ہے تیری بے وفائی کا
وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے م چمن کا جلوہ، باعث ہے، مری رنگیں نوائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب، مختصر لکھ دے م کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جدائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا م بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے، دعویٰ پارسائی کا
ہوس گستاخیِ آئینہ، تکلیفِ نظر بازی بجیبِ آرزو پنہاں ہے، حاصل دلربائی کا
نظر بازی، طلسمِ وحشت آبادِ پرستاں ہے رہا بیگانۂ تاثیر، افسوں آشنائی کا
نہ پایا دردمندِ دوریِ یارانِ یک دل نے سوادِ خطِ پیشانی سے، نسخہ مومیائی کا
تمنائے زباں، محوِ سپاسِ بے زبانی ہے م مٹا جس سے، تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
اسد، یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا

۱۸۱۶ء

کرے، اگر حیرتِ نظارہ، طوفاں نکتہ گوئی کا حبابِ چشمۂ آئینہ ہووے، بیضہ طوطی کا
بروئے قیس، دستِ شرم ہے، مژگانِ آہو سے مگر روزِ عروسی گم ہوا تھا شانہ لیلی کا
فسانِ تیغِ نازک قاتلاں، رنگِ جراحت ہے دلِ گرمِ تپش، قاصد ہے پیغامِ تسلی کا
نہیں گرداب جز سرگشتگی ہائے طلب ہرگز حبابِ بحر کو، ہے آبلوں میں خار ماہی کا
نیازِ جلوہ ریزی، طاقتِ بالیں شکستن تھا تکلف کو خیال آیا ہو گر، بیمار پرسی کا
ز بخششی فرصتِ یک شبنمستاں جلوہ خور نے تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا
اسد، تاثیرِ صافی ہائے حیرت جلوہ پرور ہو گر آبِ چشمۂ آئینہ دھووے عکس زنگی کا

زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا، وہمِ بسمل کا
چرایا زخم ہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے، اے ذوقِ خود بینی
تماشائی ہوں، وحدت خانۂ آئینۂ دل کا

شررِ فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے
بہ قدرِ رنگ، یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

سراسر تاختن کو شش جہت یک عرصہ جولاں تھا
ہوا، واماندگی سے رہرواں کی، فرقِ منزل کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
م
عبادت برق کی کرتا ہوں، اور افسوس حاصل کا

بہ قدرِ ظرف ہے، ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی
م
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے، خامہ بیدل کا

۱۸۱۶ء

فرو پیچیدنی ہے فرشِ بزمِ عیش گستر کا
دریغا! گردش آموزِ فلک ہے دورِ ساغر کا

خطِ نوخیز کی، آئینے میں دی کس نے آرائش!
کہ ہے تہ بندی پرہائے طوطی رنگِ جوہر کا

گیا جو نامہ بر، واں سے برنگِ باختہ آیا
خطوطِ روئے قاصد، نقش ہے پشتِ کبوتر کا

شکستِ گوشہ گیراں، ہے فلک کو حاصلِ گردش
صدف سے آسیائے آب میں ہے دانہ گوہر کا

فزوں ہوتا ہے ہر دم جوششِ خونباری، تماشا ہے
نفس کرتا ہے رگ ہائے مژہ پر کام نشتر کا

خیالِ شربتِ عیسیٰ گدازِ ترجبینی ہے
اسدؔ، ہوں مستِ دریا بخشیِ ساقیِ کوثر کا

۱۸۱۶ء

کیا کس شوخ نے نازاز سرِ تمکیں نشستن کا؟
کہ شاخِ گل کا خم، انداز ہے بالیں شکستن کا

نہاں ہے مردمک میں، شوقِ رخسارِ فروزاں سے
سپندِ شعلہ نادیدہ صفت، اندازِ جستن کا

گدازِ دل کو کرتی ہے، کشودِ چشم، شب پیما
نمک ہے شمع میں جوں مومِ جادو خواب بستن کا

نفس در سینہ ہائے ہم دگر رہتا ہے پیوستہ
نہیں ہے رشتۂ الفت کو اندیشہ گسستن کا

ہوائے ابر سے کی، موسمِ گل میں، نمد بافی
کہ تھا آئینۂ خور پر تصورِ زنگ بستن کا

تکلف، عافیت بیما ہے، دلا، بندِ قبا وا کر
نفس، بعد از وصالِ دوست، تاواں ہے گسستن کا

ہر اشکِ چشم سے یک حلقۂ زنجیر بڑھتا ہے
بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب، اندیشہ رفتن کا

عیادت سے، اسدؔ، میں بیشتر بیمار ہوتا ہوں
سبب ہے ناخنِ دخلِ عزیزاں، سینہ خستن کا

۱۸۱۶ء

عیادت سے زبس ٹوٹا ہے، دلِ یارانِ غمگیں کا
نظر آتا ہے موئے شیشہ، رشتہ شمعِ بالیں کا

صدا ہے کوہ میں حشر آفریں، اے غفلت اندیشاں
پئے سنجیدنِ یاراں، ہو حالِ خوابِ سنگیں کا

بجائے غنچہ و گل ہے، ہجومِ خار و خس، یاں تک
کہ حرفِ بخیۂ دامن ہوا ہے خندہ گلچیں کا

نصیبِ آستیں ہے، حاصلِ روئے عرق آگیں
چھٹے ہے کہکشاں، خرمن سے مہ کے خوشہ پرویں کا

بوقتِ کعبہ جوئیہا جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا فصلِ گل میں رشک ہے بت خانۂ چیں کا

تپیدن، دل کو سوزِ عشق میں خوابِ فراغش ہے
رکھا اسپند نے مجمر میں پہلو گرمِ تمکیں کا

اسدؔ، اربابِ فطرت قدردانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا

بہارِ رنگِ خونِ گل ہے، ساماں اشکباری کا
جنونِ برق، نشتر ہے رگِ ابرِ بہاری کا

برائے حلِ مشکل، ہوں زپا افتادۂ حسرت
بندھا ہے عقدۂ خاطر سے، پیماں خاکساری کا

بہ وقتِ سرنگونی ہے، تصور انتظارستاں
نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اخترشماری کا

لطافت، بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی م
چمن، زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں، خودداریِ ساحل م
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

اسدؔ، ساغر کشِ تسلیم ہو، گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے، گلہ بدروزگاری کا

وردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا
رشتۂ تسبیح، تارِ جادۂ منزل ہوا

محتسب سے تنگ ہے، از بسکہ کارِ مے کشاں
رز میں جو انگور نکلا، عقدۂ مشکل ہوا

قیس نے از بسکہ کی سیرِ گریبانِ نفس
یک دو جیب دامانِ صحرا، پردۂ محمل ہوا

وقتِ شب اُس شمع رو کے شعلۂ آوازہ پر
گوشِ نسریں عارضاں، پروانۂ محفل ہوا

خاکِ عاشق، بسکہ ہے فرسودۂ پروازِ شوق
جادۂ ہر دشت، تارِ دامنِ قاتل ہوا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنر مندی، اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع، کامل ہوا

۱۸۱۶ء

قطرۂ مَے، اس کی حیرت سے نفَس پرور ہوا م خطِ جامِ مے، سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا م غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا
گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو خانۂ ماتم میں، یاقوتِ نگیں، اخگر ہوا
نشّے میں گم کردہ رہ آیا، وہ مستِ فتنہ خو آج رنگِ رفتہ، دَورِ گردشِ ساغر ہوا
درد سے در پردہ دی، مژگاں سیاہاں نے شکست ریزہ ریزہ استخواں کا، پوست میں نشتر ہوا
زُہد، گردیدن ہے گردِ خانہ ہائے مُنعماں دانۂ تسبیح سے، میں مُہرہ در ششدر ہوا
اے بہ ضبطِ حال خُو نا کردگاں، جوشِ جنوں نشّۂ مَے ہے، اگر یک پردہ نازک تر ہوا
اس چمن میں ریشہ داری جس نے سر کھینچا، اسدؔ تر زبانِ شکرِ لطفِ ساقیِ کوثر ہوا

۱۸۱۶ء

دستی بن صیّاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قماشِ دام کیا
عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا
ساقی نے از بہرِ گریباں چاکیِ موجِ بادۂ ناب تارِ نگاہِ سوزنِ مینا، رشتۂ خطِ جام کیا
مُہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا
شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ ماہ کو، در تسبیحِ کواکب، جائے نشینِ امام کیا

۱۸۱۶ء

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا م بے تکلف، داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا
زہرہ، گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب م پرتوِ مہتاب، سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پانو کا بوسہ، مگر م ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا م یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا م مجھ پہ، گویا، اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط م شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا
باغ میں مجھ کو نہ لیجا، ورنہ میرے حال پر م ہر گلِ تر، ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
وائے! اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو م اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
گر وہ مستِ ناز دیوے گا صلائے عرضِ حال خارِ گل، بہرِ دہانِ گل، زباں ہو جائے گا
گر شہادت آرزو ہے، نشے میں گستاخ ہو بالِ شیشے کا، رگِ سنگِ فساں ہو جائے گا
فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے، اسد م دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

۱۸۱۶ء

تنک ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا حبابِ مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا
عجب، اے آبلہ پایانِ صحرائے نظر بازی کہ تارِ جادۂ رہ رشتۂ گوہر نہیں ہوتا
خوشا! عجزے کہ عاشق جل بجھے جوں شعلۂ خامش کہ کم از سرمہ اس کا مشتِ خاکستر نہیں ہوتا
تماشائے گل و گلشن ہے مفتِ سر بجیبی ہا پہ از چاکِ گریباں، گلستاں کا در نہیں ہوتا
نہ رکھ چشمِ حصولِ نفع، صحبت ہائے ممسک سے لبِ خشکِ صدف آبِ گہر سے تر نہیں ہوتا
نہ دیکھا کوئی ہم نے آشیاں بلبل کا گلشن میں کہ جس کے در پہ غنچہ شکلِ قفلِ زر نہیں ہوتا
صفا کب جمع ہو سکتی ہے غیر از گوشہ گیری ہا صدف بن قطرۂ نیساں، اسد، گوہر نہیں ہوتا

۱۸۱۶ء

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا م زیارت کدہ ہوں، دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی م میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

شگفتن، کمیں گاہِ تقریب جوئی — تصوّر ہوں، بے موجب آزردگاں کا
غریبِ ستم دیدۂ باز گشتن — سخن ہوں، سخن بر لب آوردگاں کا
سراپا یک آئینہ دارِ شکستن — ارادہ ہوں، یک عالم افسردگاں کا
بصورتِ تکلّف، بمعنی تأسّف — اسدؔ، میں تبسّم ہوں پژمردگاں کا

۱۸۱۶ء

ہے تنگ زِ واماندہ شدن، حوصلۂ پا — جو اشک گرا خاک میں ہے آبلۂ پا
سرمنزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور — جو خط ہے کفِ پا پہ، سو ہے سلسلۂ پا
دیدار طلب ہے دلِ واماندہ کہ آخر — نوکِ سرِ مژگاں سے رقم ہو گلۂ پا
آیا نہ بیابانِ طلب گام زباں تک — تبخالۂ لب ہو نہ سکا آبلۂ پا
فریاد سے پیدا ہے، اسدؔ، گرمیِ وحشت — تبخالۂ لب ہے جرسِ آبلۂ پا

وہ فلک رتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا — ماہ پر، ہالہ صفت، حلقۂ فتراک چڑھا
نشۂ مے کے اتر جانے کے غم سے انگور — صورتِ اشک بہ مژگانِ رگِ تاک چڑھا
بوسۂ لب سے ملی طبع کو کیفیتِ حال — مے کشیدن سے مجھے نشۂ تریاک چڑھا
میں جو گردوں کو بہ میزانِ طبیعت تولا — تھا یہ کم وزن کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا
اے اسدؔ، واشدنِ عقدۂ غم گر چاہے — حضرتِ زلف میں جوں شانہ، دلِ چاک چڑھا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری، دل بیتاب تھا — شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — م — شعلۂ جوالہ، ہر یک حلقۂ گرداب، تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — م — گریے سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں، بے تابیاں — شوخیِ بارش سے، مہ، فوارۂ سیماب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا، اسدؔ — ناخنِ غم، یاں سرِ تارِ نفس، مضراب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال م یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں، آبجو م یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پُر شور، بے خوابی سے تھا دیوار جو م واں وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفَس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی م جلوۂ گل، واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا م یاں زمیں سے آسماں تک، سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا م دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں، شب، اندازِ اثر نایاب تھا م تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا
دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا آسمانِ سفلہ جس میں یک کفِ سیلاب تھا
موج سے پیدا ہوئے، پیراہنِ دریا میں، خار گریہ، وحشت بے قرارِ جلوۂ مہتاب تھا
جوشِ تکلیفِ تماشا، محشرستانِ نگاہ فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا
بے خبر مت کہہ ہمیں، بیدرد، خود بینی سے پوچھ قلزمِ ذوقِ نظر میں آئنہ پایاب تھا
بے دلی ہائے اسدؔ، افسردگی آہنگ تر یادِ ایامے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا
مقدمِ سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے! م خانۂ عاشق، مگر، سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں؟ م پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں م ذرہ ذرہ، روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟ م کل تلک تیرا بھی دل، مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا م انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے م اُس کی سیلِ گریہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا

● ۱۸۱۶ء

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا م رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا
بت پرستی ہے، بہارِ نقش بندی ہائے دہر ہر صریرِ خامہ میں، اک نالۂ ناقوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا م کس قدر، یا رب، ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جُز شکستِ آرزو م
دل بہ دل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں؟ م
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

طبع کی واشد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا
یہ دلِ وابستہ، گویا، بیضۂ طاؤس تھا

کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں
دست بر سر، سر بزانوئے دلِ مایوس تھا

● ۱۸۱۶ء

شبِ اختر، قدحِ عیش نے محمل باندھا
بارِ یک قافلۂ آبلہ منزل باندھا

سُبحۂ واماندگیِ شوق، وتماشا منظور
جادہ پر، زیورِ صد آئینہ منزل باندھا

ضبطِ گریہ، گہرِ آبلہ لایا آخر
پائے صد موج، بہ طوفاں کدۂ دل باندھا

حیف! اے تنگیِ تمنا، کہ پئے عرضِ حیا
یک عرق آئینہ، بر جبہۂ سائل باندھا

حسن آشفتگیِ جلوہ، ہے عرضِ اعجاز
دستِ موسیٰ بہ سرِ دعویِ باطل باندھا

تپشِ آئینہ، پروازِ تمنا لائی
نامۂ شوق، بہ بالِ پرِ بسمل باندھا

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں، کس نے
خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا؟

نااُمیدی نے، بہ تقریبِ مضامینِ خُمار
کوچۂ موج کو خمیازۂ ساحل باندھا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے، غالب
ساز پر رشتہ، پئے نغمۂ بیدل، باندھا

● ۱۸۱۶ء

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا م
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے م
ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی، اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں م
شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے م
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن م غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار م لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں م حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
جاں دادگاں کا حوصلہ، فرصت گداز ہے یاں عرصۂ تپیدنِ بسمل نہیں رہا
ہوں قطرہ زن بمرحلۂ یاس روز و شب جز تارِ اشک، جادۂ منزل نہیں رہا
اے آہ، میری خاطرِ وابستہ کے سوا دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا
ہر چند میں ہوں طوطیِ شیریں سخن، ولے آئینہ، آہ! میرے مقابل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر، اسدؔ م جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

خلوتِ آبلۂ پا میں ہے، جولاں میرا خوں ہے، دل تنگیِ وحشت سے، بیاباں میرا
ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا موجِ خمیازہ ہے، ہر زخمِ نمایاں میرا
عیشِ بازیکدۂ حسرتِ جاوید رسا خونِ آدینہ سے رنگیں ہے، دبستاں میرا
حسرتِ نشۂ وحشت نہ بہ سعیِ دل ہے عرضِ خمیازۂ مجنوں ہے، گریباں میرا
عالمِ بے سر و سامانیِ فرصت مت پوچھ لنگرِ وحشتِ مجنوں ہے، بیاباں میرا
بے دماغِ تپشِ رشک ہوں، اے جلوۂ حسن تشنۂ خونِ دل و دیدہ ہے پیماں میرا
فہم، زنجیریِ بے ربطیِ دل ہے، یا رب! کس زباں میں ہے لقبِ خوابِ پریشاں میرا
بہ ہوس، دردِ سرِ اہلِ سلامت تا چند؟ مشکلِ عشق ہوں، مطلب نہیں آساں میرا
سرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے م کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم م تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا
بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی، اسدؔ دے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

۱۸۱۶ء

بہ مہرِ نامہ جو بوسۂ گلِ پیام رہا ہمارا کام ہوا، اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد بسانِ اشک، گرفتارِ چشمِ دام رہا

دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے ۔۔۔ ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر، شبِ سنبل ۔۔۔ پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا؟ ۔۔۔ کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا
نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا، غالب ۔۔۔ خیالِ زلف و رخِ دوست صبح و شام رہا

● ۱۸۱۶ء

خط جو رخ پر جانشینِ ہالۂ مہ ہو گیا ۔۔۔ ہالۂ دودِ شعلۂ جوالۂ مہ ہو گیا
حلقۂ گیسو کھلا دورِ خطِ رخسار پر ۔۔۔ ہالۂ دیگر بہ گردِ ہالۂ مہ ہو گیا
شب کہ مستِ دیدنِ مہتاب تھا وہ جامہ زیب ۔۔۔ پارۂ چاکِ کتاں، پرکالۂ مہ ہو گیا
شب کہ وہ گل باغ میں تھا جلوہ فرما، اے اسد ۔۔۔ داغِ مہ، جوشِ چمن سے لالۂ مہ ہو گیا

● ۱۸۱۶ء

بس کہ عاجز نارسائی سے کبوتر ہو گیا ۔۔۔ صفحۂ نامہ، غلافِ بالشِ پر ہو گیا
صورتِ دیبا تپش سے میری، غرقِ خوں ہے آج ۔۔۔ خارۂ پیراہن، رگِ بستر کو نشتر ہو گیا
بسکہ آئینے نے پایا گرمیِ رخ سے گداز ۔۔۔ دامنِ تمثال، مثلِ برگِ گل، تر ہو گیا
شعلہ رخسارا، تحیّر سے تری رفتار کے ۔۔۔ خارِ شمعِ آئنہ، آتش میں جوہر ہو گیا
بسکہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار ۔۔۔ دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہو گیا
حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر، اے اسد ۔۔۔ نقشِ پائے خضر یاں، سدِّ سکندر ہو گیا

● ۱۸۱۶ء

یک گام بیخودی سے لوٹیں بہارِ صحرا ۔۔۔ آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا
وحشت اگر رسا ہے، بے حاصلی ادا ہے ۔۔۔ پیمانۂ ہوا ہے، مشتِ غبارِ صحرا

اے آبلے، کرم کر، یاں رنجۂ یک قدم کر
اے نورِ چشمِ وحشت، اے یادگارِ صحرا

دل در رکابِ صحرا، خانہ خرابِ صحرا
موجِ سرابِ صحرا، عرضِ خمارِ صحرا

ہر ذرہ یک دلِ پاک، آئینہ خانہ بے خاک
تمثالِ شوقِ بے باک، صد جادو جا بہ صحرا

دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے
سر میں ہوائے گلشن، دل میں غبارِ صحرا

دلِ بیتاب، کہ سینے میں دمِ چند رہا
بدمِ چند گرفتارِ غمِ چند رہا

زندگی کے ہوئے ناگہ نفسِ چند تمام
کوچۂ یار جو مجھ سے قدمِ چند رہا

لکھ سکا میں نہ اسے شکوۂ پیماں شکنی
لاجرم، توڑ کے، عاجز، قلمِ چند رہا

الفتِ زر، ہمہ نقصاں ہے، کہ آخر قارون
زیرِ بارِ غمِ دام و درمِ چند رہا

عمر بھر ہوش نہ یک جا ہوئے میرے کہ، اسدؔ
یوں پرستندۂ روئے صنمِ چند رہا

۱۸۱۶ء

جگر سے ٹوٹے ہوئے ہوگا، ہے، سناں پیدا
دہانِ زخم میں، آخر، ہوئی زباں پیدا

بسانِ سبزہ رگِ خواب ہے زباں ایجاد
کرے ہے خامشی احوالِ بیخوداں پیدا

صفائے شوخی و اندازِ حسن پا بہ رکاب
خطِ سیاہ سے ہے گردِ کارواں پیدا

نہیں ہے آہ کو ایمائے تیر باریدن
وگرنہ ہے خمِ تسلیم سے کماں پیدا

نصیبِ تیرہ، بلا گردش آفریں ہے، اسدؔ
زمیں سے ہوتے ہیں، صد دامنِ آسماں پیدا

۱۸۱۶ء

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
م آتشِ خاموش کے مانند، گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں / آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا م

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل، بارہا / میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا م

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟ / کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا م

دل نہیں تجھ کو دکھاتا، ورنہ، داغوں کی بہار / اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا م

دود میرا، سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری / بسکہ ذوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

شمع رویوں کی سرِ انگشتِ حنائی دیکھ کر / غنچۂ گل، پرفشاں پروانہ آسا، جل گیا

خانمانِ عاشقاں، دوکانِ آتش باز ہے / شعلہ رو جب ہو گئے گرمِ تماشا، جل گیا

تا کجا افسوسِ گرمی ہائے صحبت؟ اے خیال / دل بہ سوزِ آتشِ داغِ تمنا، جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب، کہ دل / دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا، جل گیا م

نہاں کیفیتِ مے میں ہے سامانِ حجاب اس کا / بنا ہے پنبۂ مینا سے ساقی نے نقاب اس کا

اگر اس شعلہ رو کو دوں پیامِ مجلس افروزی / زبانِ شمعِ خلوت خانہ دیتی ہے جواب اس کا

عیاں کیفیتِ میخانہ ہے جوئے گلستاں میں / کہ مے عکسِ شفق ہے اور ساغر ہے حباب اس کا

اٹھائے ہیں جو میں افتادگی میں متصل صدمے / کروں گا اشکہائے واچکیدہ سے حساب اس کا

اسد کے واسطے رنگِ بروئے کار ہو پیدا / غبار، آوارہ سرگشتہ ہے، یا بوتراب، اس کا

زبس ہے نازبردارِ غرورِ نشۂ صہبا / رگِ بالیدہ گردن ہے موجِ بادہ در مینا

در آب، آئینہ از جوشِ عکسِ گیسوئے مشکیں / بہارِ سنبلستاں جلوہ گر ہے اس سوئے دریا

کہاں ہے دیدۂ روشن کہ دیکھے بے حجابانہ / نقابِ یار ہے از بس کہ دہ ہائے چشمِ نابینا

نہ دے تجھ پاسِ ضبطِ آبرو، وقتِ شکستن بھی / تحمل پیشۂ تمکین رہے آئینہ آسا

اسد، طبعِ متیں سے گر نکالوں شعرِ برجستہ / شرر، ہو قطرۂ خونِ فسردہ در رگِ خارا

۱۸۱۶ء

گرفتاری میں، فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا
کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا

زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی نے
چمن بالیدنی ہا، از رمِ نخچیر ہے پیدا

نگہ وہ شوخ ہے طوفاں طرازِ شوقِ خوں ریزی
کہ در بحرِ کماں بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا

نہیں ہے کف لبِ نازک پہ فرطِ نشۂ مے سے
لطافت ہائے جوشِ حسن کا سرِ شیر ہے پیدا

عروجِ نا امیدی، چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے؟
بہارِ بے خزاں، از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

اسد، جس شوق سے ذرّے تپش فرسا ہوں لاغر میں
جراحت ہائے دل سے، جوہرِ شمشیر ہے پیدا

۱۸۱۶ء

سحر گر باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا
اُڑے رنگِ گل، اور آئینہ دیوار ہو پیدا

بتاں، زہر اب اس شدت سے دو پیکانِ ناوک کو
کہ خطِ سبز تا پشتِ لبِ سوفار ہو پیدا

لگے گر سنگ سر پر، یار کے دستِ نگاریں سے
بجائے زخم، گل بر گوشۂ دستار ہو پیدا

کروں گر عرضِ سنگینیِ کہسار اپنی بیتابی
رگِ ہر سنگ سے نبضِ دلِ بیمار ہو پیدا

بہ سنگِ شیشہ توڑوں، ساقیا، پیمانۂ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

اسد، مایوس مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

۱۸۱۶ء

بس کہ ہے میخانہ ویراں، جوں بیابانِ خراب
عکسِ چشمِ آہوئے رمخوردہ ہے، داغِ شراب

تیرگیِ ظاہری، ہے طبعِ آگہ کا نشاں
غافلاں، عکسِ سوادِ صفحہ ہے، گردِ کتاب

یک نگاہِ صاف، صد آئینۂ تاثیر ہے
ہے رگِ یاقوت، عکسِ خطِ جامِ آفتاب

ہے عرق افشاں کشی سے، ادہمِ مشکینِ یار
وقتِ شب اختر گنے ہے چشمِ بیدارِ رکاب

ہے شفق، سوزِ جگر کی آگ کی بالیدگی — ہر یک اختر ہے فلک پر قطرۂ اشکِ کباب

بس کہ شرمِ عارضِ رنگیں سے حیرت جلوہ ہے — ہے شکستِ رنگِ گل، آئینۂ پردازِ نقاب

شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا، اے اسدؔ — گر گیا بامِ فلک سے صبح، طشتِ ماہتاب

۱۸۱۶ء

بے بہاراں ہیں خزاں حاصل، خیالِ عندلیب — رنگِ گل آتشکدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب

عشق کو ہر رنگ شانِ حسن ہے مدِّ نظر — مصرعِ سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب

حیرتِ حسنِ چمن پیرا سے تیرے، رنگِ گل — بسملِ ذوقِ پریدن ہے بہ بالِ عندلیب

عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حسنِ یار — گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

منع مت کر حسن کی، ہم کو، پرستش سے کہ ہے — بادۂ نظارۂ گلشن، حلالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر، کارِ اسدؔ — اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

۱۸۱۶ء

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست م دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید، خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر م کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے م صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے م کشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے م دیدۂ پرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں م بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی، غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک م مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ م سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر م ہنس کے، کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانیہائے دشمن کی شکایت کیجیے م یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ م ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ، زبس تکرارِ دوست

چشمِ بندِ خلق، غیر از نقشِ خود بینی نہیں　　آئنہ ہے قالبِ خشتِ در و دیوارِ دوست

برقِ خرمن زارِ گوہر ہے، نگاہِ تیز، یاں　　اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیِ رفتارِ دوست

ہے سوا نیزے پہ، اُس کے قامتِ نو خیز سے　　آفتابِ روزِ محشر ہے، گلِ دستارِ دوست

لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا ہے، اسدؔ　　آتشِ مے سے بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

۱۸۱۶ء

جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھے ہے اُدھر انگشت　　یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے، مگر انگشت

میں الفتِ مژگاں میں جو انگشت نما ہوں　　لگتی ہے مجھے تیر کے مانند، ہر انگشت

ہر غنچۂ گل، صورتِ یک قطرۂ خوں ہے　　دیکھا ہے کسو کا جو حنا بستہ سرِ انگشت

گرمی ہے زباں کی، سببِ سوختنِ جاں　　ہر شمع، شہادت کو ہے یاں سر بسرِ انگشت

خوں دل میں جو میرے نہیں باقی، تو پھر اُس کی　　جوں ماہیِ بے آب، تڑپتی ہے ہر انگشت

شوخی تری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا　　رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ درِ انگشت

کس رتبے میں باریکی و نرمی ہے، کہ جوں گل　　آتی نہیں پنجے میں بس اُس کے نظر انگشت

افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے م تا رکھ نہ سکے، کوئی مرے حرف پہ، انگشت

کافی ہے نشانی، ترا چھلّے کا نہ دینا م جن لوگوں کی، تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

لکھتا ہوں، اسدؔ، سوزشِ دل سے سخنِ گرم م خالی مجھے دکھلا کے، بوقتِ سفر انگشت

۱۸۱۶ء

دودِ شمعِ کشتہ گل، بزم سامانی عبث　　یک شبہ آشفتہ نازِ سنبلستانی عبث

ہے، ہوس، محمل بدوشِ شوخیِ ساقی مست　　نشۂ مے کے تصور میں نگہبانی عبث

باز ماندنہائے مژگاں، ہے یک آغوشِ وداع　　عید، در حیرت سوادِ چشمِ قربانی عبث

جز غبارِ کردہ سیر، آہنگیِ پرواز کو؟　　بلبلِ تصویر و دعوائے پر افشانی عبث

سر نوشتِ خلق، ہے طغرائے عجزِ اختیار　　آرزو ہا خارخارِ چینِ پیشانی عبث

جب کہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب — وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث
دستِ بہم سودہ ہے، مژگانِ خوابیدہ، اسدؔ — اے دل از کف دادۂ غفلت، پشیمانی عبث

● ١٨١٦ء

نازِ لطفِ عشق، با وصفِ توانائی، عبث — رنگ ہے سنگِ محک، دعوائے مینائی عبث
ناخنِ دخلِ عزیزاں، یک قلم ہے نقب زن — پاسبانیِ طلسمِ گنجِ تنہائی عبث
محلِ پیمانۂ فرصت ہے بر دوشِ حباب — دعویِ دریا کشی و نشہ پیمائی عبث
جانِ عاشق حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے — دل کو، اے بیداد خو، تعلیمِ خارائی عبث
یک نگاہِ گرم ہے، جوں شمع، سرتا پا گداز — بہرِ از خود رفتگاں، رنجِ خود آرائی عبث
قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت — بن گیا تقلید سے میری، یہ سودائی عبث
اے اسدؔ، بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز — عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

● ١٨١٦ء

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج م — قمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ م — تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت، کنارہ کر، اے انتظام، چل م — سیلابِ گریہ، درپئے دیوار و در ہے آج
معزولیِ تپش ہوئی، افراطِ انتظار — چشمِ کشودہ، حلقۂ بیرونِ در ہے آج
حیرت فروشِ صد نگرانی ہے، اضطرار — ہر رشتہ چاکِ جیب کا، تارِ نظر ہے آج
ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار — نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج
کرتی ہے عاجزی، سفرِ سوختن، تمام — پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج
تا صبح ہے بہ منزلِ مقصد رسیدنی — دودِ چراغِ خانہ، غبارِ سفر ہے آج
دور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے، اسدؔ — مرغِ خیال، بلبلِ بے بال و پر ہے آج

● ١٨١٦ء

جنبشِ ہر رگ سے، ہے گُل کے لب کو اختلاج
حبِّ شبنم سے صبا ہر صبح کرتی ہے علاج

شاخِ گُل جنبش میں ہے، گہوارہ آسا، ہر نفَس
طفلِ شوخِ غنچۂ گُل، بسکہ، ہے وحشی مزاج

سیرِ ملکِ حسن کر، میخانہ ہا نذرِ خمار
چشمِ مستِ یار سے، ہے گردنِ مینا پہ باج

گریہ ہائے بیدلاں، گنجِ شرر در آستیں
قہرمانِ عشق میں، حسرت سے لیتے ہیں خراج

رنگریزِ جسم و جاں نے از خمستانِ عدم
خرقۂ ہستی نکالا ہے برنگِ احتیاج

ہے سوادِ چشمِ قربانی میں یک عالم مقیم
حسرتِ فرصت جہاں دیتی ہے عبرت کو رواج

اے اسدؔ، ہے مستعدِّ شانہ گیسو شدن
پنجۂ مژگاں بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

۱۸۱۶ء

بیدل، نہ نازِ وحشتِ جیبِ دریدہ کھینچ
جوں بوئے غنچہ، یک نفَسِ آرمیدہ کھینچ

یک مشتِ خوں ہے، پرتوِ خور سے، تمام دشت
دردِ طلب بہ آبلۂ نادمیدہ کھینچ

پیچیدگی ہے حاملِ طومارِ انتظار
پائے نظر بہ دامنِ شوقِ دویدہ کھینچ

برقِ بہار سے ہوں میں پا در حنا ہنوز
اے خارِ دشت، دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ

بخود بہ لطفِ چشمکِ عبرت ہے، چشمِ صید
یک داغِ حسرتِ نفَسِ ناکشیدہ کھینچ

بزمِ نظر میں بیضۂ طاؤسِ خلوتاں
فرشِ طرب بہ گلشنِ ناآفریدہ کھینچ

دریا بساطِ دعوتِ سیلاب ہے، اسدؔ
ساغر بہ بارگاہِ دماغِ رسیدہ کھینچ!

۱۸۱۶ء

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

حیرت ہمہ اسرار، پہ مجبورِ خموشی
ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ

تمثالِ گداز آئنہ، ہے عبرتِ بینش
نظارہ تحیّر، چمنستانِ بقا ہیچ

گلزارِ دمیدن، شررستانِ رمیدن
فرصت تپش، و حوصلۂ نشو و نما ہیچ

آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے
ہستی میں نہیں شوخیِ ایجادِ صدا، ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے، اے عجزِ تمنا؟
سامانِ دعا وحشت، و تاثیرِ دعا ہیچ

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

۱۸۱۶ء

دعویِ عشقِ بتاں سے بہ گلستاں گل و صبح
ہیں رقیبانہ بہم دست و گریباں گل و صبح

ساقِ گل رنگ سے، اور آئنۂ زانو سے
جامہ زیبوں کے سدا ہیں، تہِ داماں گل و صبح

وصلِ آئینہ رخاں، ہم نفسِ یک دیگر
ہیں دعاہائے سحرگاہ سے خواہاں گل و صبح

آئنہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بے خود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند، اسدؔ
غفلت آرامیِ یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

۱۸۱۶ء

بسکہ وہ پاکوبیاں در پردۂ وحشت ہیں یاد
ہے غلافِ دفچۂ خورشید، ہر یک گرد باد

طرزِ موزونی بہ صرفِ جنگ جوئیہائے یار
ہے سرِ مصراعِ صافِ تیغ، خنجر مستزاد

ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں
کیوں نہ ہووے آج کے دن عیسیٰ کی روح شاد؟

کیجیے آہوئے ختن کو خضرِ صحرائے طلب
مشک ہے سنبلستانِ زلف میں، گردِ سواد

ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد

بسکہ ہیں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام
آستر ہے خرقۂ زہاد کا، صوفِ مداد

تیغ در کف، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد، اے آرزوئے مرگِ غالبؔ! مژدہ باد

۱۸۱۶ء

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
اے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند

ویرانے سے، جز آمد و رفتِ نفس نہیں
ہے کوچہ ہائے نے میں، غبارِ صدا، بلند

رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دوست
مژگانِ باز ماندہ سے، دستِ دعا، بلند

موقوف کیجیے یہ تکلف نگاریاں
ہوتا ہے، ورنہ، شعلۂ رنگِ حنا، بلند

قربانِ اوج ریزیِ چشمِ حیا پرست
یک آسماں ہے، مرتبۂ پشتِ پا، بلند

ہے، دلبری، کمین گرِ ایجادِ یک نگاہ
کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا، بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جاں فزا، اسد
در ہر نفس بقدرِ نفس ہے، قبا، بلند

۱۸۱۶ء

حسرتِ دستگہ و پائے تحمل تا چند؟
رگِ گردن، خطِ پیمانۂ بے مُل تا چند؟

ہے گلیمِ سیہ بختِ پریشاں، کاکل
موئے نہ بافتنِ ریشۂ سنبل تا چند؟

کوکبِ بخت، بجز روزنِ پردوذ نہیں
عینکِ چشمِ جنوں، حلقۂ کاکل تا چند؟

چشم بے خونِ دل، و دل تہی از جوشِ نگاہ
بہ زباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند؟

بزم داغِ طرب، و باغ کشادِ پرِ رنگ
شمع و گل تا کے؟ و پروانہ و بلبل تا چند؟

نالہ دامِ ہوس، و دردِ اسیری معدوم
شرح بربودِ غلطیہائے تحمل تا چند؟

جوہرِ آئینۂ فکرِ سخن موئے دماغ
عرضِ حسرت، پسِ زانوئے تامل تا چند؟

سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا
ناکسی، آئینۂ نازِ توکل تا چند!

اسدِ خستہ، گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کنِ یک خلق، تغافل تا چند؟

۱۸۱۶ء

بہ کامِ دل کریں، کس طرح گمرہاں، فریاد؟
ہوئی ہے لغزشِ پا، بختِ زباں، فریاد!

کمالِ بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی
ز دستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں فریاد

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں؟ ورنہ
بہ رنگِ نے ہے نہاں، در ہر استخواں فریاد

تغافل آئنہ دارِ خموشئ دل ہے
ہوئی ہے محو بتقریبِ امتحاں فریاد

ہلاکِ بیخبری، نغمۂ وجود و عدم
جہان و اہلِ جہاں سے، جہاں جہاں فریاد

جوابِ سنگ دلی ہائے دشمناں، ہمت
ز دستِ شیشہ دلی ہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں فریاد

شیشۂ آتشیں، رخِ پُرنور
عرق از خط چکیدہ، روغنِ مور

بسکہ ہوں بعدِ مرگ بھی نگراں
مردمک سے ہے خال بر لبِ گور

بار لائی ہے دانہ ہائے سرشک
مژہ، ہے ریشۂ رزِ انگور

ظلم کرنا گدائے عاشق پر
نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو، مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے، وصال کا مذکور

زندگانی پہ اعتماد غلط
ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور؟

کیجیے، جوں اشک، اور قطرہ زنی
اے اسد، ہے ہنوز دلّی دور

● ۱۸۱۶ء

بسکہ مائل ہے وہ رشکِ ماہتاب آئینے پر
ہے نفس، تارِ شعاعِ آفتاب آئینے پر

بازگشتِ جادہ پیمائے رہِ حیرت کہاں؟
غافلاں، نقش جان کر، چھڑکے ہیں آب آئینے پر

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری
بیدلوں کو ہے براتِ اضطراب آئینے پر

نازِ خود بینی کے باعث، مجرمِ صد بیگناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ تاب آئینے پر

ناتوانی نے نہ چھوڑا بسکہ بیش از عکسِ جسم
مفتِ واگستردنی ہے، فرشِ خواب آئینے پر

مدعی، میری صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا، زشت رویوں کا عتاب آئینے پر

سدِ اسکندر رہے بہرِ نگاہِ گل رخاں
گر کرے یوں امر، نہی بو تراب، آئینے پر

دل کو توڑا جوشِ بیتابی سے، غالب، کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینے پر؟

۱۸۱۶ء

دنداں کا خیال، چشمِ تر، کر — ہر دانۂ اشک کو گہر کر
آتی نہیں نیند، اے شبِ تار — افسانۂ زلفِ یار سر کر
اے دل، بخیالِ عارضِ یار — یہ شامِ غم آپ پر سحر کر
ہر چند اُمید دور تر ہو — اے حوصلے، سعی بیشتر کر
میں آپ سے جا چکا ہوں، اب بھی — اے بے خبری، اُسے خبر کر
افسانہ، اسدؔ، بایں درازی — اے غمزدہ، قصہ مختصر کر

۱۸۱۶ء

جنبش، بہ سعیِ ضبطِ جنوں، نوبہار تر — دل، در گدازِ نالہ، نگہ آبیار تر
قاتل بہ عزمِ ناز، و دل از زخم در گداز — شمشیر آبدار، و نگہ آب دار تر
ہے کسوتِ عروجِ تغافل، کمالِ حسن — چشمِ سیہ، بمرگِ نگہ، سوگوار تر
سعیِ خرام، کاوشِ ایجادِ جلوہ ہے — جوشِ چکیدنِ عرق، آئینہ کار تر
ہے سر بگرد باد، حلقۂ فتراکِ بیخودی — مجنونِ دشتِ عشق، تحیر شکار تر
اے چرخ، خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات — لیکن بنائے عہدِ وفا اُستوار تر
سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ — جتنا کہ نا اُمید تر، امیدوار تر
آئینہ داغِ حیرت، و حیرت شکنجِ یاس — سیماب بیقرار، و اسدؔ بیقرار تر

۱۸۱۶ء

فسونِ یک دلی ہے لذتِ بیدادِ دشمن پر — کہ وجدِ برق، جوں پروانہ، بال افشاں ہے خرمن پر
تکلف، خار خارِ التماسِ بے قراری ہے — کہ رشتہ باندھتا ہے پیرہن انگشتِ سوزن پر
یہ کیا وحشت ہے، اے دیوانے، پیش از مرگ واویلا — رکھی بے جا بنائے خانۂ زنجیرِ شیون پر
جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی؟ — گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے!
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک، ہے موقوف گلخن پر

اسد بسمل ہے کس انداز کا؟ قاتل سے کہتا تھا
کہ "مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

۱۸۱۶ء

صفائے حیرتِ آئینہ، ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آبِ برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی، مجھے، داغِ پلنگ آخر

خطِ نوخیز، نیلِ چشمِ زخمِ صافیِ عارض
لیا آئینے نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ، آخر

ہلال آسا تہی رہ، گر کشادن ہائے دل چاہے
ہوا مہ، کثرتِ سرمایہ اندوزی سے تنگ آخر

تڑپ کر مر گیا وہ صیدِ بال افشاں کہ مضطر تھا
ہوا ناسورِ چشمِ تعزیت، زخمِ خدنگ، آخر

لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی
ہوئی قطرہ فشانی ہائے مے بارانِ سنگ آخر

اسد، پیری میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے
نہیں ہے نغمے سے خالی، خمیدن ہائے چنگ آخر

۱۸۱۶ء

دیا یاروں نے بے ہوشی میں درماں کا فریب آخر
ہوا سکتے سے، میں آئینۂ دستِ طبیب، آخر

رگِ گل، جادۂ تارِ نگہ سے حد موافق ہے
ملیں گے منزلِ الفت میں ہم اور عندلیب، آخر

غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بے قراری سے
نیازِ پرفشانی ہو گیا صبر و شکیب، آخر

ستم کش مصلحت سے ہوں، کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب، آخر

اسد کی طرح میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں
ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرت نصیب، آخر

۱۸۱۶ء

حسنِ خود آرا کو ہے مشقِ تغافل ہنوز
ہے کفِ مشاطہ میں آئینۂ گل ہنوز

سادگیِ یک خیال، شوخیِ صد رنگ نقش
حیرتِ آئینہ ہے جیبِ تأمل ہنوز

سادہ و پرکار تر، غافل و ہشیار تر
مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل ہنوز

ساقیِ تعلیمِ رنج، محفل و تمکینِ گراں
سیلیِ استاد ہے ساغرِ بے مُل ہنوز

شغلِ ہوس در نظر، ایک حیا بے خبر
شاخِ گل نغمہ ہے، نالۂ بلبل ہنوز

دل کی صدائے شکست سازِ طرب ہے اسد
شیشۂ بے بادہ سے چاہے ہے قلقل ہنوز

۱۸۱۶ء

چاکِ گریباں کو ہے ربط تأمل ہنوز
غنچے میں دل تنگ ہے، حوصلۂ گل ہنوز

دل میں ہے، سودائے زلف، مستِ تغافل ہنوز
ہے مژہ خوابناک ریشۂ سنبل ہنوز

پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرواز سے
ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

عشق کمین گاہِ درد، وحشتِ دل دور گرد
دام تہِ سبزہ ہے، حلقۂ کاکل ہنوز

لذتِ تقریرِ عشق، پردگیِ گوشِ دل
جوہرِ افسانہ ہے عرضِ تجمل ہنوز

آئینۂ امتحاں، تندیِ تغافل، اسد
شش جہت اسباب ہے وہمِ توکل ہنوز

۱۸۱۶ء

بے گانۂ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز
وہ سبزہ سنگ پر نہ اُگا، کوہکن ہنوز

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

یارب، یہ درد مند ہے کس کی نگاہ کا
ہے ربطِ مشک و داغِ سوادِ ختن ہنوز

جوں جادہ، سر بہ کوئے تمنائے بیدلی / زنجیرِ پا ہے رشتۂ حبُّ الوطن ہنوز
میں دور گردِ قربِ بساطِ نگاہ تھا / بیرونِ دل نہ تھی تپشِ انجمن ہنوز
تھا مجھ کو خارِ خارِ جنونِ وفا، اسدؔ / سوزن میں تھا نہفتہ گلِ پیرہن ہنوز

● ۱۸۱۶ء

میں ہوں سرابِ یک تپش آموختن ہنوز / زخمِ جگر ہے تشنۂ لب دوختن ہنوز
اے شعلہ، فرصتے کہ سویدائے دل سے ہوں / کشتِ سپندِ صد جگر اندوختن ہنوز
فانوسِ شمع ہے کفنِ کشتگانِ شوق / در پردہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز
مجنوں، فسونِ شعلہ خرامی فسانہ ہے / ہے شمعِ جادہ، داغِ نیفروختن ہنوز
گو یک شرر بہ کلبۂ ساز چراغاں کروں، اسدؔ / بزمِ طرب ہے پردگیِ سوختن ہنوز

● ۱۸۱۶ء

داغِ اطفال ہے دیوانہ بکہسار ہنوز / خلوتِ سنگ میں ہے نالہ طلبگار ہنوز
خانہ ہے، سیل سے، خو کردۂ دیدار ہنوز / دوربیں در زدہ ہے رخنۂ دیوار ہنوز
آئی یک عمر سے معذورِ تماشا نرگس / چشمِ شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز
کیوں ہوا تھا طرفِ آبلۂ پا، یارب؟ / جادہ ہے وا شدنِ پیچشِ طومار ہنوز
وسعتِ سعیِ کرم دیکھ، کہ سرتاسرِ خاک م / گزرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت م / نقشِ پا میں ہے تبِ گرمیِ رفتار ہنوز
ہوں خموشیِ چمن حسرتِ دیدار، اسدؔ / مژہ ہے شانہ کشِ طرۂ گفتار ہنوز

نہ بندھا تھا بعدم نقشِ دلِ مور ہنوز / تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز
سبزہ ہے نوکِ زبانِ دہنِ گور ہنوز / حسرتِ عرضِ تمنا میں ہوں رنجور ہنوز
صد تجلی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت / پیرہن میں ہے غبارِ سفرِ طور ہنوز

زخمِ دل میں ہے نہاں غنچۂ پیکانِ نگار — جلوۂ باغ ہے در پردۂ ناسورِ ہنوز

پا بہ پر از آبلہ راہِ طلبِ مے میں ہوا — ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز

گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی — سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

اے اسدؔ، تیرگیِ بختِ سیہ ظاہر ہے — نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

● ۱۸۱۶ء

گو بیابانِ تمنا و کجا جولانِ عجز؟ — آبلے پا کے، ہیں یاں رفتار کو دندانِ عجز

ہو قبولِ کم نگاہی، تحفۂ اہلِ نیاز — اے دل و اے جانِ ناز، اے دین و اے ایمانِ عجز

بوسہ پا، انتخابِ بدگمانی ہائے حسن — یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز

حسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمی ہائے ناز — عشق نے واکی ہے ہر یک خار سے مژگانِ عجز

اضطرابِ نارسائی، مایۂ شرمندگی — ہے عرق ریزیِ خجلت، جوششِ طوفانِ عجز

وہ جہاں مسند نشینِ بارگاہِ ناز ہو — قامتِ خوباں، ہو محرابِ نیازستانِ عجز

بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت، اے اسدؔ — گرد باد اس راہ کا، ہے عقدۂ پیمانِ عجز

● ۱۸۱۶ء

حاصلِ دلبستگی ہے عمرِ کوتہ اور بس — وقتِ عرضِ عقدہ ہائے متصل تارِ نفس

کیوں نہ طوطیِ طبیعت نغمہ پیرائی کرے — باندھتا ہے، رنگِ گل، آئینہ تا چاکِ قفس

اے ادا فہماں، صدا ہے تشنگیِ فرصتِ خوں — ہے بہ صحرائے تحیر، چشمِ قربانی، جرس

تیز تر ہوتا ہے خشمِ تند خوباں عجز سے — ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہ، خار و خس

سختیِ راہِ محبت، منعِ دخلِ غیر ہے — پیچ تابِ جادہ، ہے یاں جوہرِ تیغِ عسس

اے اسدؔ، ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں — ظاہرا، صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

● ۱۸۱۶ء

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس — پیچ تابِ جادہ، ہے خطِ کفِ افسوس و بس

نیم رنگیہائے شمعِ محفلِ خوباں سے ہے
پیچکِ مہ، صرفِ چاکِ پردۂ فانوس و بس

ہے تصور میں نہاں، سرمایۂ صد گلستاں
کاسۂ زانو، ہے مجھ کو بیضۂ طاؤس و بس

کفر ہے، غیر از دفورِ شوق، رہبر ڈھونڈھنا
راہِ صحرائے حرم یاں ہے، جرس، ناقوس و بس

یک جہاں گل، تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسد
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

۱۸۱۶ء

کرتا ہے، بیادِ بتِ رنگیں، دلِ مایوس
رنگِ زنظر رفتہ، حنائے کفِ افسوس

تھا خواب میں، کیا جلوہ پرستارِ زلیخا؟
ہے بالشِ دل سوختگاں میں، پرِ طاؤس

حیرت سے ترے جلوے کی، از بسکہ ہیں بے کار
غور، قطرۂ شبنم میں ہے، جوں شمع بفانوس

دریافتنِ صحبتِ اغیار غرض ہے
اے نامہ رساں، نامہ رسا چاہیے جاسوس

ہے مشق، اسد، دستگہِ وصل کی منظور
ہوں خاک نشیں، از پئے ادراکِ قدمبوس

۱۸۱۶ء

ہوئی ہے بسکہ صرفِ مشقِ تمکینِ بہار، آتش
بہ اندازِ حنا، ہے رونقِ دستِ چنار آتش

شرر ہے رنگ، بعد اظہارِ تاب جلوۂ تمکیں
کرے ہے سنگ پر، خورشید، آبِ روئے کار آتش

گدازِ موم ہے افسونِ ربطِ پیکر آرائی
نکالے کب، نہالِ شمع، بے تخمِ شرار آتش

نہ لیوے گر، خسِ جوہر، طراوت، سبزۂ خط سے
م لگاوے خانۂ آئینہ میں، روئے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
م نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار، آتش

خیالِ دود تھا، سر جوشِ سودائے غلط فہمی
اگر رکھتی نہ خاکسترنشینی کا غبار، آتش

ہوائے پرفشانی، برقِ خرمن ہائے خاطر ہے
ببالِ شعلۂ بے تاب، ہے پروانہ زار آتش

نہیں، برق و شرر، جز وحشت و ضبطِ تپیدن ہا
بلا گردانِ بے پروا خرامیہائے یار آتش

دھوئیں سے آگ کے، اک ابر دریا بار ہو پیدا
اسد، حیدر پرستوں سے، اگر ہووے دوچار آتش

۱۸۱۶ء

باقلیمِ سخن ہے جلوۂ گردِ سواد، آتش
کہ ہے، دودِ چراغاں سے، ہیولائے مداد، آتش

اگر مضمونِ خاکستر کرے دیباچہ آرائی
نہ باندھے شعلہ جوالہ غیر از گرد باد، آتش

کرے ہے لطفِ انداز برہنہ گوئیِ خوباں
بتقریبِ نگارشہائے سطرِ شعلہ یاد، آتش

دیا داغِ جگر کو آہ نے سامانِ شگفتن کا
ہوا بالیدہ، غیر از جنبشِ دامانِ باد، آتش

اسد، قدرت سے حیدر کی، ہوئی ہر گبر و ترسا کو
شرارِ سنگِ بت، بہرِ بنائے اعتقاد، آتش

● ۱۸۱۶ء

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع م
چرخ وا کرتا ہے، ماہِ نو سے آغوشِ وداع

شمع سے ہے، بزم، انگشتِ تحیر در دہن
شعلۂ آوازِ خوباں پر بہنگامِ سماع

جوں پرِ طاؤس، جوہر تختۂ مشقِ رنگ ہے
بسکہ ہے وہ قبلۂ آئینہ محوِ اختراع

رنجشِ حیرت سرشتاں، سینہ صافی پیشکش
جوہرِ آئینہ ہے یاں، گردِ میدانِ نزاع

چار سوئے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے
عقل کے نقصاں سے اٹھتا ہے خیالِ انتفاع

آشنا، غالب، نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تاب استماع؟

● ۱۸۱۶ء

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع م
ہوئی ہے، آتشِ گل، آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموشی م
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے، حرف بایمائے شعلہ، قصہ تمام م
بطرزِ اہلِ فنا ہے، فسانہ خوانیِ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے، اے شعلے م
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے م
بجلوہ ریزیِ باد، و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ م
شگفتگی ہے، شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پہ مجھ کو م
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

● ۱۸۱۶ء

عشاق، اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ
دیتا ہے اور، جوں گل و شبنم، بہار داغ

جوں چشم، باز ماندہ ہے ہر یک بسوے دل
رکھتا ہے داغِ تازہ کا یاں انتظار، داغ

بے لالہ عارضاں مجھے گلگشتِ باغ میں
دیتی ہے، گرمیِ گل و بلبل، ہزار داغ

جوں اعتمادِ نامہ و خط کا ہو مُہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار، داغ

ہوتے ہیں محوِ جلوۂ خور سے، ستارگاں
دیکھ اُس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں، اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار، داغ

● ۱۸۱۶ء

بلبلوں کو دور سے کرتا ہے منعِ بارِ باغ
ہے، زبانِ پاسباں، خارِ سرِ دیوارِ باغ

کون آیا جو چمن بیتابِ استقبال ہے؟
جنبشِ موجِ صبا، ہے شوخیِ رفتارِ باغ

میں ہمہ حیرت، جنوں بیتابِ دورانِ خمار
مردمِ چشمِ تماشا، نقطۂ پرکارِ باغ

آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دلِ سردِ صبا سے، گرمیِ بازارِ باغ

کون گل سے ضعف و خاموشیِ بلبل کہہ سکے؟
نے زبانِ غنچہ گویا، نے زبانِ خارِ باغ

جوششِ گل، کرتا ہے استقبالِ تحریر، اسدؔ
زیرِ مشقِ شعر، ہے نقش از پئے احضارِ باغ

● ۱۸۱۶ء

نامہ بھی لکھتے ہو، تو بخطِ غبار، حیف!
رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت، ہزار حیف!

بیش از نفس، بتاں کے کرم نے وفا نہ کی
تھا محملِ نگاہ بدوشِ شرار، حیف!

تھی میرے ہی جلانے کو، اے آہ، شعلہ ریز
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار، حیف!

گل، چہرہ ہے کسو خفقانی مزاج کا
گھبرا رہی ہے بیمِ خزاں سے بہار، حیف!

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے　م　اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار، حیف!
ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش　مجبوریاں تلک ہوئے، اے اختیار، حیف!
ہے میری مشتِ خاک سے اس کو کدورتیں　پائی جگہ بھی دل میں، تو ہو کر غبار، حیف!
بنتا، اسدؔ، میں سرمۂ چشمِ رکابِ یار　آیا نہ میری خاک پہ وہ شہسوار، حیف!

۱۸۱۶ء

عیسیٰ مہرباں ہے، شفا ریز یک طرف　درد آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف
سنجیدنی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن　خوابِ گرانِ خسروِ پرویز یک طرف
خرمن بباد دادۂ دعویٰ ہیں ہو، سو رہو　ہم یک طرف ہیں، برقِ شرر بیز یک طرف
مفتِ دل و جگر، خلشِ غمزہ ہائے ناز　کاوش فروشیِ مژۂ تیز یک طرف
ہر مُو، بدن پہ شہپرِ پرواز ہے مجھے　بے تابیِ دلِ تپش انگیز یک طرف
یک جانب، اے اسدؔ، شبِ فرقت کا بیم ہے　دامِ ہوس ہے، زلفِ دلآویز یک طرف

۱۸۱۶ء

اے آرزو! شہیدِ وفا! خوں بہا نہ مانگ　جز بہرِ دست و بازوے قاتل، دعا نہ مانگ
گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ　م　یعنی، بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے، داغِ حسرتِ دل کا شمار، یاد　م　مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا، نہ مانگ
گستاخیِ وصال، ہے مشاطۂ نیاز　یعنی، دعا بجز خمِ زلفِ دوتا نہ مانگ
برہم ہے، بزمِ غنچہ، بیک جنبشِ نشاط　کاشانہ بسکہ تنگ ہے تغافل، ہوا نہ مانگ
عیسیٰ، طلسمِ حسن تغافل ہے، زینہار　جز پشتِ چشم، نسخۂ عرضِ دوا نہ مانگ
میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں　دشمن سمجھ، و لے نگہِ آشنا نہ مانگ
نظارہ دیگر، و دلِ خونیں نفس دگر　آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ
یک بختِ اوج، نذرِ سبکباری، اسدؔ　سر پر، و بالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

۱۸۱۶ء

بدر، ہے آئینۂ طاقِ ہلال
غافلاں، نقصاں سے پیدا ہے کمال

ہے بیادِ زلفِ مشکیں سال و ماہ
روزِ روشن، شام آس سوئے خیال

بسکہ ہے اصلِ دمیدنہا، غبار
ہے نہالِ شکوہ، ریحانِ سفال

صافیِ رخ سے ترے، ہنگام شب
عکسِ داغِ مہ، ہوا عارض پہ خال

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ تھا خرشید یک دستِ سوال

شورِ حشر اُس فتنہ قامت کے حضور
سایہ آسا ہوگیا ہے پائمال

ہو جو بلبل پیروِ فکرِ اسدؔ
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

۱۸۱۶ء

ہوں، بوحشت، انتظار آوارۂ دشتِ خیال
اک سفیدی مارتی ہے دور سے، چشمِ غزال

ہے نفس پروردہ، گلشن، کس ہوائے بام کا؟
طوقِ قمری میں ہے، سروِ باغ، ریحانِ سفال

ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخم دل پر رحم کر
آخر اس پردے میں تو ہنستی تھی، اے صبحِ وصال

بیکسی افسردہ ہوں، اے ناتوانی، کیا کروں؟
جلوۂ خرشید سے ہے گرم، پہلوئے ہلال

شکوہ درد و درد داغ، اے بیوفا، معذور رکھ
خوں بہائے یک جہاں امید ہے، تیرا خیال

عرضِ دردِ بیوفائی، وحشت اندیشہ ہے
خوں ہوا دل، تا جگر، یارب، زبانِ شکوہ لال!

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے، اسدؔ
مالِ مستی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

۱۸۱۶ء

ہر عضو، غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
جوں زلفِ یار، ہوں میں سراپا شکستہ دل

ہے سرنوشت میں رقمِ واشکستگی
ہوں، جوں خطِ شکستہ، بہرجا شکستہ دل

امواج کی جو یہ شکنیں آشکار ہیں!
ہے چشمِ اشک ریز سے، دریا شکستہ دل

ناسازیِ نصیب، درشتیِ غم سے ہے
صہبا فتادہ، خاطر، و مینا شکستہ دل

ہے سنگِ ظلمِ چرخ سے مینخانے میں، اسد — اُمید نا اُمید و تمنا شکستہ دل

۱۸۱۶ء

بہرِ عرضِ حالِ شبنم ہے رقمِ ایجادِ گل — ظاہرا ہے اس چمن سے ملالِ مادر زاد، گل
گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یاد، گل — غنچے سے منقارِ بلبل وار ہو فریاد، گل
گر یہ بزمِ باغ، کھینچے نقشِ روئے یار کو — شمع ساں ہو جائے قطِ خامۂ بہزاد، گل
دستِ رنگیں سے جو رخ پر وا کرے زلفِ رسا — شاخِ گل میں ہے نہاں، جوں شانہ در شمشاد، گل
سعیِ عاشق ہے فروغ افزائے آبِ روئے کار — ہے شرارِ تیشہ، بہرِ تربتِ فرہاد، گل

ہے تصور، صافیِ قطعِ نظر از غیرِ یار — لختِ دل سے لاوے ہے، شمعِ خیال آباد، گل
گلشن آبادِ دلِ مجروح میں ہو جائے ہے — غنچۂ پیکانِ شاخِ ناوکِ صیاد، گل
برقِ سامانِ نظر ہے، جلوۂ بیباکِ حسن — شمعِ خلوت خانہ کیجے ہر چہ باداباد، گل
خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستاں، اسد — عشرتیں کرتی ہے، میری خاطرِ آزاد، گل

۱۸۱۶ء

گرچہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگ، دل — ہے چمن سرمایۂ بالیدنِ صد رنگ، دل
بیدلوں سے ہے تپش، جوں خواہشِ آب از سراب — ہے شررِ موہوم، اگر رکھتا نہ ہووے سنگ دل
رشتۂ فہمیدِ ممسک ہے بہ بندِ کوتہی — عقدہ ساں ہے کیسۂ زر پر خیالِ تنگ دل
ہوں زپا افتادۂ اندازِ یادِ حسنِ سبز — کس قدر ہے نشہ فرسائے خمارِ بنگ، دل
شوقِ بے پروا کے ہاتھوں، تنگیِ سازِ نادرست — کھینچتا ہے آج نالے خارج از آہنگ، دل
اے اسد، خامُش ہے طوطیِ شکر گفتارِ طبع — ظاہرا رکھتا ہے آئینہ اسیرِ زنگ، دل

۱۸۱۶ء

اثر کمندیِ فریادِ نارسا معلوم — غبارِ نالہ، کمیں گاہِ مدعا معلوم
بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے — وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم
بہار، در گرِ غنچہ، شہرِ جولاں ہے — طلسمِ ناز، بجز تنگیِ قبا معلوم
بنالہ، حاصلِ دلبستگی فراہم کر — متاعِ خانۂ زنجیر، بجز صدا معلوم

طلسمِ خاک، کمیں گاہِ یک جہاں سودا
بسرگ، تکیۂ آسایشِ فنا معلوم

تکلف، آئینۂ دو جہاں مدارا ہے
سراغِ یک نگہِ قہر آشنا معلوم

اسد فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگرنہ دلبریِ وعدۂ وفا معلوم

● ۱۸۱۶ء

از انجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم
رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم

رمیدن، گلِ باغِ واماندگی ہے
عبث محمل آرائے رفتار ہیں ہم

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دُرودن
کہ ضبطِ تپش سے شررکار ہیں ہم

تغافل، کمیں گاہِ وحشت شناسی
نگہبانِ دلہائے اغیار ہیں ہم

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا، گنہ گار ہیں ہم

نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسد، شکوہ کفر، و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

● ۱۸۱۶ء

یاں اشک جدا گرم ہے، اور آہ جدا گرم
عشرت کدۂ عشق کی ہے آب و ہوا گرم

اُس شعلے نے گلگوں کو جو گلشن میں کیا گرم
پھولوں کو ہوئی بادِ بہاری وہ ہوا گرم

وا کر سکے یاں کون بجز کاوشِ شوخی
جوں برق ہے پیچیدگیِ بندِ قبا گرم

گر ہے سرِ دریوزگیِ جلوۂ دیدار
جوں پنجۂ خورشید ہوا ہے دستِ دعا، گرم

یہ آتشِ ہمسایہ کہیں گھر نہ جلادے
کی ہے دلِ سوزاں نے مرے پہلو میں جا گرم

غیروں سے اُسے گرمِ سخن دیکھ کے، غالب
میں رشک سے، جوں آتشِ خاموش، رہا گرم

بسکہ ہیں بدمستِ بشکن بشکنِ میخانہ ہم
موئے شیشہ کو سمجھتے ہیں خطِ پیمانہ ہم

بسکہ ہر یک موئے زلف، افشاں سے، ہے تارِ شعاع
پنجۂ خورشید کو سمجھے ہیں دستِ شانہ ہم

ہے فروغِ ماہ سے، ہر موج، اک تصویرِ چاک
سیل سے، فرشِ کتاں کرتے ہیں تا ویرانہ ہم

مشقِ از خود رفتگی سے ہیں بہ گلزارِ خیال
آشنا تعبیرِ خوابِ سبزۂ بیگانہ ہم

فرطِ بے خوابی سے ہیں شب ہائے ہجرِ یار میں
جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم

جانتے ہیں، جوششِ سودائے زلفِ یار میں
سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم

بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں، جوں شمعِ خلوتخانہ ہم

شامِ غم میں، سوزِ عشقِ آتشِ رخسار سے
پرفشانِ سوختن ہیں، صورتِ پروانہ ہم

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے، گنجفہ بازِ خیال م
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں م
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے، نَے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو م
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ م
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

۱۸۱۶ء

جس دم کہ جادہ وار ہو تارِ نفس تمام
پیمائشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام

کیا دے صدا؟ کہ کلفتِ گم گشتگاں سے "آہ"
ہے سرمہ، گردِ رہ، بگولے جرس تمام

ڈرتا ہوں کوچہ گردیِ بازارِ عشق سے
ہیں، خارِ راہ، جوہرِ تیغِ عسس تمام

اے بالِ اضطراب، کہاں تک فسردگی؟
یک پرزدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام

گزرا جو آشیاں کا تصور بوقتِ بند
مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں، اسدؔ
اب کے بہار کا یونہیں گزرا برس تمام

۱۸۱۶ء

خوش وحشتے کہ عرضِ جنونِ فنا کروں
جوں گردِ راہ، جامۂ ہستی قبا کروں

گر بعدِ مرگ وحشتِ دل کا گلا کروں
موجِ غبار سے پرِ یک دشت وا کروں

آ اے بہارِ ناز، کہ تیرے خرام سے
دستار گردِ شاخِ گلِ نقشِ پا کروں

خوش اوفتادگی! کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ، گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کروں

صبر اور یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک
درد اور یہ کمیں کہ رہِ نالہ وا کروں

وہ بے دماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں
وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں

وہ التماسِ لذتِ بیداد ہوں کہ میں　　تیغِ ستم کو پشتِ خمِ التجا کروں
وہ رازِ نالہ ہوں کہ بشرحِ نگاہِ عجز　　افشاں، غبارِ سرمہ سے، فردِ صدا کروں
لوں وامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش، و لے　م　غالبؔ، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

۱۸۱۶ء

کسو کو زِ خود رستہ کم دیکھتے ہیں　　کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں
خطِ لختِ دل یک قلم دیکھتے ہیں　　مژہ کو جواہر رقم دیکھتے ہیں
سرابِ یقیں ہیں پریشاں نگاہاں　　اسدؔ کو گراز چشمِ کم دیکھتے ہیں
کہ ہم بیضۂ طوطیِ ہند، غافل　　تہِ بالِ شمعِ حرم دیکھتے ہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں　م　خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے　م　سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے، یک قدِ آدم　م　قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ، اے محوِ آئینہ داری　م　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے　م　کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا، ہم بھیس، غالبؔ　م　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۸۱۶ء

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں　م　ہیں جمع، سویدائے دلِ چشم میں آہیں
جوں مردمکِ چشم میں ہوں جمع، نگاہیں　　خوابیدہ بحیرت کدۂ داغ ہیں آہیں
پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں　　جوں دود، فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں
پایا سرِ ہر ذرہ، جگر گوشۂ وحشت　　ہیں داغ سے معمور، شقائق کی کلاہیں

کس دل پہ ہے عزمِ صفِ مژگانِ خود آرا؟
آئینے کے پایاب سے اتری ہیں سپاہیں

دیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

یہ مطلع، اسد، جوہرِ افسونِ سخن ہو
گر عرضِ تپاکِ نفسِ سوختہ چاہیں

سرت کشِ یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں
کھینچوں ہوں سویدائے دلِ چشم سے آہیں

۶۱۸۱۶ ●

بس جا کر پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں
دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں

کس جرم سے ہے چشم تجھے حسرتِ قبول
برگِ حنا مگر مژۂ خوں فشاں نہیں

ہر رنگِ گردش، آئنہ ایجادِ درد ہے
اشکِ سحاب، جز بوداعِ خزاں نہیں

جز عجز کیا کروں بہ تمنائے بے خودی؟
طاقت، حریفِ سختیِ خوابِ گراں نہیں

عبرت سے پوچھ دردِ پریشانیِ نگاہ
یہ گردِ وہم جز بسرِ امتحاں نہیں

گل، غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے
اے آگہی، فریبِ تماشا کہاں نہیں

برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن، اسد
اے دلفسردہ، طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

۶۱۸۱۶ ●

مرگِ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں
تھا حریرِ سنگ سے، قطعِ کفن کی فکر میں

فرصتِ یک چشمِ حیرت، شش جہت آغوش ہے
ہوں سپند آسا، وداعِ انجمن کی فکر میں

وہ غریبِ وحشت آبادِ تسلی ہوں، کہ جسے
کوچہ دے ہے زخمِ دل، صبحِ وطن کی فکر میں

سایۂ گل داغ، و جوشِ نکہتِ گل موجِ دود
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

فالِ ہستی، خار خارِ وحشتِ اندیشہ ہے
شوخیِ سوزن ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

غفلتِ دیوانہ، جز تمہیدِ آگاہی نہیں
مغزِ سر، خوابِ پریشاں ہے سخن کی فکر میں

مجھ میں اور مجنوں میں، وحشت، سازِ دعوا ہے، اسد
برگِ برگِ بید ہے ناخن زدن کی فکر میں

۶۱۸۱۶ ●

ہے ترحّم آفریں، آرائشِ بیداد، یاں
اشکِ چشمِ دام ہے، ہر دانہ، صیّاد، یاں

ہے، گدازِ موم، اندازِ چکیدن ہائے خوں
نیشِ زنبورِ عسل، ہے نشترِ فصّاد، یاں

ناگوارا ہے ہمیں، احسانِ صاحب دولتاں
ہے، زرِ گل بھی، نظر میں جوہرِ فولاد، یاں

جنبشِ دل سے ہوے ہیں، عقدہ ہائے کار، وا
کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے، فرہاد، یاں

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں، اسد
ہے تماشا کردنی گلچینیِ جلاد، یاں

● ١٨١٦ء

اے نوا سازِ تماشا، سر بکف جلتا ہوں میں
یک طرف جلتا ہے دل، اور یکطرف جلتا ہوں میں

شمع ہوں، لیکن بپا در رفتہ خارِ جستجو
مدعا گم کردہ، ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں

ہے، مساسِ دستِ افسوس، آتش انگیزِ تپش
بے تکلف آپ پیدا کر کے تف جلتا ہوں میں

ہے تماشا گاہِ سوزِ ناز، ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دِوالی، صف بہ صف جلتا ہوں میں

شمع ہوں، تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح
بے محل، اے مجلس آرائے نجف، جلتا ہوں میں

● ١٨١٦ء

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ، سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

برہنہ مستیِ صبحِ بہار رکھتے ہیں
جنونِ حسرتِ یک جامہ وار رکھتے ہیں

طلسمِ مستیِ دل آں سوے، ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہمیں، حریرِ شرر بافِ سنگ، خلعت ہے
یہ ایک پیرہنِ زرنگار رکھتے ہیں

نگاہِ دیدۂ نقشِ قدم ہے، جادۂ راہ
گزشتگاں، اثرِ انتظار رکھتے ہیں

ہوا ہے، گریۂ بیباک، ضبط سے تسبیح
ہزار دل پہ ہم ایک اختیار رکھتے ہیں

بساطِ ہیچ کسی میں، برنگِ ریگِ رواں
ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں

برنگِ سایہ، سرو کارِ انتظار نہ پوچھ
سراغِ خلوتِ شب ہائے تار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے، غالب
بسانِ دشت، دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

۱۸۱۶ء

تن بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں — دلِ ز کارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں
تمیزِ زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں — بہ عکسِ آئینہ، یک فردِ سادہ رکھتے ہیں
برنگِ سایہ ہمیں بندگی میں ہے تسلیم — کہ داغِ دل بہ جبینِ کشادہ رکھتے ہیں
بزاہداں، رگِ گردن، ہے رشتۂ زنّار — سرِ بپائے بتے نانہادہ رکھتے ہیں
معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز — دلِ بدستِ نگارے ندادہ رکھتے ہیں
برنگِ سبزہ، عزیزانِ بدزباں یکدست — ہزار تیغ بزہراب دادہ رکھتے ہیں
ادب نے سونپی ہمیں سرمہ سائیِ حیرت — زبانِ بستہ و چشمِ کشادہ رکھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد — م — وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

بغفلت عطرِ گل، ہم آگہی مخمور، ملتے ہیں — چراغانِ تماشا چشمِ صد ناسور ملتے ہیں
رہا کس جسم سے میں بیقرارِ داغِ ہمطرحی؟ — سمندر کو پرِ پروانہ سے کافور ملتے ہیں
چمن ناحرمِ آگاہیِ دیدارِ خوباں ہے — سحر گلہائے نرگس چند چشمِ کور ملتے ہیں
کجا جوہر؟ چہ عکسِ خط؟ بتاں وقتِ خود آرائی — دلِ آئینہ زیرِ پائے تخیلِ مور ملتے ہیں
تماشائے بہار، آئینہ پردازِ تسلی ہے — کفِ گلبرگ سے پائے دلِ رنجور ملتے ہیں
گراں جانی بسنگ سار، و تماشا بیدماغ آیا — کفِ افسوسِ فرصت، رنگِ کوہِ طور ملتے ہیں
اسد حسرت کشِ یک داغِ مشک اندودہ ہے یارب — لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

۱۸۱۶ء

سرشکِ آشفتہ سر تھا قطرہ زن مژگاں سے جانے میں — رہے یاں، شوخیِ رفتار سے، پا آستانے میں
ہجومِ مژدۂ دیدار، و پروازِ تماشا ہا — گلِ اقبالِ عشق ہے، چشمِ بلبل، آشیانے میں
ہوئی یہ بیخودی چشم و زباں کو تیرے جلوے سے — کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں

ترے کوچے میں ہے، مشاطۂ واماندگی، قاصد — پرِ پروازِ زلفِ ناز ہے ہدہد کے شانے میں
کجا معزولیِ آئینہ؟ کو ترکِ خود آرائی؟ — نمد در آب ہے، اے سادہ پرکار اس بہانے میں
بحکمِ عجز، ابروئے مہِ تو حیرت ایما ہے — کریاں گم کر جبینِ سجدہ فرسا آستانے میں

۱۸۱۶ء

فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کشتن میں — ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم، جوہر تیغِ دشمن میں
تماشا کردنی ہے لطفِ زخمِ انتظار، اے دل — سوادِ داغِ مرہم، مردمک ہے چشمِ سوزن میں
دل و دین و خرد، تاراجِ نازِ جلوہ پیرائی — ہوا ہے جوہرِ آئینہ، خیلِ مور خرمن میں
نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں م ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی م کفِ سیلاب باقی ہے، برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں م نگینِ نامِ شاہد ہے مرے، ہر قطرہ خوں، تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی؟ م شبِ مہ ہو، جو رکھ دوں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی م ہوا ہے، خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے م پر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں
نجانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے م جو گل ہوں، تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں، تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو م سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں، تن میں
اسدؔ، زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں م خمِ دستِ نوازش، ہو گیا ہے طوق گردن میں

۱۸۱۶ء

خوں در جگر نہفتہ، بہ زردی رمیدہ ہوں — خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں
ہے دستِ ردِ سیرِ جہاں، بستنِ نظر — پائے ہوس بدامنِ مژگاں کشیدہ ہوں
میں چشمِ واکشادہ، و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں
تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہوا حصول — اے بے خبر، میں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
مانندِ موجِ آب، زبانِ بریدہ ہوں

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یارب، میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا، عبث
پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مفتِ بتاں، اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں
شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں

دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متصل
خمخانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں

کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف
تسبیحِ اشک ہائے زِ مژگاں چکیدہ ہوں

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پشت بدنداں گزیدہ ہوں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش
مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں

ہے جنبشِ زباں بدہن سخت ناگوار
خونابۂ بلابلِ حسرت چشیدہ ہوں

ہوں بوئے گل، ہوں گرچہ گراں بارِ شستِ زر
لیکن، اسدؔ، بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

● ۱۸۱۶ء

ہوئی ہیں آب، شرمِ کوشش بیجا سے، تدبیریں
عرق ریزِ تپش ہیں، موج کے مانند، زنجیریں

خیالِ سادگی ہائے تصور، نقشِ حیرت ہے
پرِ عنقا پہ رنگِ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں

زبس ہر شمع یاں آئینۂ حیرت پرستی ہے
کرے ہیں غنچہ منقارِ طوطی نقش، گل گیریں

بپیند آہنگیِ ہستی، وسعیِ نارسائی
غبار آلودہ ہیں، جوں دودِ شمعِ کشتہ، تقریریں

ہجومِ سادہ لوحی، پنبۂ گوشِ حریفاں ہے
وگرنہ خواب کی، مضمر ہیں افسانے میں، تعبیریں

بتانِ شوخ کی تمکین بعد از قتل کی حیرت
بیاضِ دیدۂ نخچیر پر کھینچے ہے تصویریں

اسدؔ، طرزِ عروجِ اضطرابِ دل کو کیا کہیے
سمجھتا ہوں تپش کو الفتِ قاتل کی تاثیریں

● ۱۸۱۶ء

بے دماغی، حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس، زنجیرِ رسوائی نہیں

وحشتِ خو کردۂ نظّارہ ہے، حیرت، جسے
حلقۂ زنجیر، جز چشمِ تماشائی نہیں

قطرے کو جوشِ عرق کرتا ہے دریا دستگاہ
جز حیا، پرکارِ سعیِ بے سر و پائی نہیں

چشمِ نرگس میں نمک بھرتی ہے شبنم سے، بہار
فرصتِ نشو و نما، سازِ شکیبائی نہیں

کس کو دوں، یارب، حسابِ سوزناکیہائے دل؟
آمد و رفتِ نفس، جز شعلہ پیمائی نہیں

مت رکھ، اے انجام غافل، سازِ ہستی پر غرور
چیونٹی کے پر، سر و برگِ خود آرائی نہیں

سایۂ افتادگی بالین و بستر ہوں، اسد
جوں صنوبر، دل سراپا قامت آرائی نہیں

۱۸۱۶ء

ظاہرا سرپنجۂ افتادگاں گیرا نہیں
ورنہ کب حسرت کشِ دامن پہ نقشِ پا نہیں

آنکھیں پتھرائی ہیں، نا محسوس ہے تارِ نگاہ
ہے زمیں ازبسکہ سنگیں، جادہ بھی پیدا نہیں

ہو چکے ہم جادہ ساں صد بار قطع، اور پھر ہنوز
زینتِ یک پیرہن، جوں دامنِ صحرا، نہیں

ہو سکے ہے پردۂ جوشیدنِ خونِ جگر
اشک، بعدِ ضبط، غیر از پنبۂ مینا نہیں

ہو سکے کب کلفتِ دل، مانعِ سیلانِ اشک؟
گردِ ساحل، سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں

ہے طلسمِ دہر میں، صد حشر پاداشِ عمل
آگہی غافل، کہ ایک امروز بے فردا نہیں

بسملِ اس تیغِ دو دستی کا نہیں بچتا، اسد
عافیت بیزار، ذوقِ کعبتین اچھا نہیں

۱۸۱۶ء

ضبط سے مطلب، بجز وارستگی، دیگر نہیں
دامنِ تمثال، آبِ آئنہ سے تر نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے، برہم خوردنِ بزمِ سرور
لختِ لختِ شیشۂ بشکستہ، جز نشتر نہیں

واں سیاہی مردمک ہے اور یاں داغِ شراب
مہ، حریفِ نازشِ ہم چشمیِ ساغر نہیں

ہے فلک بالا نشینِ فیضِ خمِ گردیدگی
عاجزی سے، ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

دل کو اظہارِ سخن، اندازِ فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ، غیر از اصطکاکِ در نہیں

کب تلک پھیرے اسد لب ہائے تفتہ پر زباں؟
تابِ عرضِ تشنگی، اے ساقیِ کوثر، نہیں

۱۸۱۶ء

ضمانِ بادہ رؤیا ندن ہے خطِ جامِ مَے نوشاں
وگرنہ منزلِ حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں؟

نہیں ہے، ضبط، جز مشاقگی ہائے غم آرائی
کہ میلِ سرمہ چشمِ داغ میں ہے، آہِ خاموشاں

بہ ہنگامِ تصورِ ساغرِ زانو سے پیتا ہوں
مئے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبح آغوشاں

نشانِ روشنیِ دل نہاں ہے تیرہ بختوں کا
نہیں محسوس، دودِ مشعلِ بزمِ سیہ پوشاں

پریشانی، اسدؔ، در پردہ ہے سامانِ جمعیت
کہ ہے آبادیِ صحرا، ہجومِ خانہ بر دوشاں

۱۸۱۶ء

نہیں ہے بے سبب قطرے کو، شکلِ گوہر، افسردن
گرہ ہے حسرتِ آبے بروئے کار آوردن

مہ نو سے ہے، رہزن وار، نعلِ واژگوں باندھا
نہیں ممکن بجولاں ہائے گردوں نعل پے بردن

خمارِ ضبط سے بھی نشۂ اظہار پیدا ہے
تراوش شیرۂ انگور کی ہے مفتِ افسردن

خراب آبادِ غربت میں عبث، افسوسِ ویرانی
گلِ از شاخ دور افتادہ ہے نزدیکِ پژمردن

فغان و آہ سے حاصل بجز دردِ سرِ یاراں
خوشا! اے غفلتِ آگاہاں، نفَس دزدیدن و مردن

دریغا! بستنِ رختِ سفر سے ہو کے میں غافل
رہا پامالِ حسرت ہائے فرشِ بزم گستردن

اسدؔ ہے طبع مجبورِ تمنا آفرینی ہا
فغاں! اے اختیاری و فریبِ آرزو خوردن

۱۸۱۶ء

دیکھیے مت چشمِ کم سے سوئے ضبط افسردگاں
جوں صدف پُر در ہیں، دنداں در جگر افشردگاں

گرمیٔ تکلیفِ دل رنجیدہ ہے از بسکہ، چرخ
قرصِ مہ کافوری ہے، بہرِ از سرما خوردگاں

رنجشِ دل یک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
دشت ساماں ہے، غبارِ خاطرِ آزردگاں

ہاتھ پر مہ ہاتھ، تو درسِ تأسف ہی سہی
شوقِ مفتِ زندگی ہے، اے بغفلت مردگاں

خار سے گل سینہ افگارِ جفا ہے، اے اسدؔ
بہ رگ ریزی ہے پر افشانیِ ناوک خوردگاں

١٨١٦ء

سازشِ صلحِ بتاں میں ہے نہاں جنگیدن | نغمہ و چنگ ہیں جوں تیر و کماں فہمیدن
بسکہ شرمندۂ بوئے خوشِ گل رویاں ہے | نکہتِ گل کو ہے غنچے میں نفس دزدیدن
ہے فروغِ رخِ افروختۂ خوباں سے | شعلۂ شمع، پر افشانِ بخود لرزیدن
گلشنِ زخم کھلاتا ہے جگر میں، پیکاں | گرہِ غنچہ، ہے، سامانِ چمن بالیدن
چمنِ دہر میں ہوں سبزۂ بیگانہ، اسدؔ | وائے! اے بے خودی و تہمتِ آرامیدن

١٨١٦ء

صاف ہے از بسکہ عکسِ گل سے، گلزارِ چمن | جانشینِ جوہرِ آئینہ ہے، خارِ چمن
ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن | قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے | کھل گئی، مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گل سے، غلط ہے، دعوئ وارستگی | سرو ہے، باوصفِ آزادی، گرفتارِ چمن
تیری آرائش کا استقبال کرتی ہے بہار | جوہرِ آئینہ، ہے یاں نقشِ احضارِ چمن
بسکہ پائی یار کی رنگیں ادائی سے شکست | ہے، کلاہِ نازِ گل، بر طاقِ دیوارِ چمن
وقت ہے، گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے | یوسفِ گل جلوہ فرما ہے ببازارِ چمن
وحشت افزا گریہ ہا موقوفِ فصلِ گل، اسدؔ | چشمِ دریا بار ہے میرآبِ سرکارِ چمن

١٨١٦ء

منقار سے رکھتا ہوں، ہم چاکِ قفس کو | تا کی زِ جگر زخم میں ہے راہ نفس کو
بیباک ہوں از بسکہ ببازارِ محبت | سمجھا ہوں زرہ جوہرِ شمشیرِ عسس کو
رہنے دو گرفتار بہ زندانِ خموشی | چھیڑو نہ مجھ افسردۂ دزدیدہ نفس کو

پیدا ہوئے ہیں ہم الم آبادِ جہاں میں — فرسودنِ پائے طلب و دستِ ہوس کو
نالاں ہو، اسد، تو بھی سرِ راہ گزر پر — کہتے ہیں کہ تاثیر ہے فریادِ جرس کو

۱۸۱۶ء

اگر وہ آفتِ نظّارہ جلوہ گستر ہو — بلال، ناخنکِ دیدہ ہائے اختر ہو
بپیادِ قامت، اگر ہو بلند آتشِ غم — ہر ایک داغِ جگر، آفتابِ محشر ہو
ستم کشی کا، کیا دل نے، حوصلہ پیدا — اب اُس سے ربط کروں، جو بہت ستمگر ہو
عجب نہیں، پئے تحریرِ حالِ گریۂ چشم — بروئے آب جو، ہر موج، نقشِ مسطر ہو
اُمیدوار ہوں، تاثیرِ تلخ کامی سے — کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو
صدف کی، ہے ترے نقشِ قدم میں، کیفیت — سرِشکِ چشمِ اسد، کیوں نہ اس میں گوہر ہو

۱۸۱۶ء

بے درد، سر بہ سجدۂ الفت فرو نہ ہو — جوں شمع، غوطہ داغ میں کھا، گر وضو نہ ہو
دل دے کفِ تغافلِ ابروئے یار میں — آئینہ ایسے طاق پہ گم کر کہ تو نہ ہو
زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار — یارب، بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہوا
تمثالِ ناز، جلوۂ نیرنگِ اعتبار — ہستی عدم ہے، آئینہ گر روبرو نہ ہو
مژگاں خلیدۂ رگِ ابرِ بہار ہے — نشتر، بمغزِ پنبۂ مینا فرو نہ ہو
عرضِ نشاطِ دید ہے، مژگانِ انتظار — یارب کہ خارِ پیرہنِ آرزو نہ ہوا
واں پر فشانِ دامِ نظر ہوں جہاں، اسدؔ — صبحِ بہار بھی، قفسِ رنگ و بو نہ ہو

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو — م — کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی — م — بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آجاوے — م — کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو

ہم بالیدنِ سنگ و گلِ صحرا یہ چاہے ہے | کہ تارِ جادہ بھی کہسار کو زُنّارِ مینا ہو
حریفِ وحشتِ نازِ نسیمِ عشق جب آؤں | کہ مثلِ غنچہ، سازِ یک گلستاں دل مہیا ہو
بجائے دانۂ خرمن، یک بیاباں بیضۂ قمری | مرا حاصل وہ نسخہ ہے کہ جس سے خاک پیدا ہو
کرے کیا سازِ بینش وہ شہیدِ دردِ آگاہی؟ | جسے موئے دماغِ بیخودی، خوابِ زلیخا ہو
وہ دل، جوں شمع، بہرِ دعوتِ نظّارہ لا جس سے | نگہ لبریزِ اشک و سینہ معمورِ تمنا ہو
نہ دیکھیں روئے یک دل سرد، غیر از شمعِ کافوری | خدایا، اس قدر بزمِ اسدؔ گرمِ تماشا ہو

۱۸۱۶ء

مبادا، بے تکلّف فصل کا برگ و نوا گم ہو | مگر طوفانِ مے میں بخششِ موجِ صبا گم ہو
سبب، وارستگاں کو تنگیِ ہمت ہے، خداوندا | اثر شرمے سے اور لب ہائے عاشق سے صدا گم ہو
نہیں جز دردِ تسکینِ نکوہش ہائے بیدرداں | کہ موجِ گریہ میں صد خندۂ دنداں نما گم ہو
ہوئی ہے ناتوانی، بیدماغِ شوخیِ مطلب | فرو ہوتا ہے سر سجدے میں اے دستِ دعا گم ہو
بجھے ہم مفت دیویں یک جہاں چینِ جبیں، لیکن | مبادا اے پیچ و تابِ طبع، نقشِ مدعا گم ہو
بلا گردانِ تمکینِ بتاں، صد موجۂ گوہر | عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو
اٹھا دے کب وہ جانِ شرمِ تہمت قتلِ عاشق کی | کہ جس کے ہاتھ میں، مانندِ خوں، رنگِ حنا گم ہو
کریں خوباں جو سیرِ حسن، اسدؔ، یک پردہ نازک تر | دمِ صبحِ قیامت، تا در گریبانِ قبا گم ہو

۱۸۱۶ء

خشکیِ مے نے تلف کی میکدے کی آبرو | کاسۂ دریوزہ ہے، پیمانۂ دستِ سبو
بہرِ جاں پروردنِ یعقوب، بالِ خاک سے | دام لیتے ہیں، پرِ پروانۂ پیراہن کی بو
گردِ ساحل ہے، بہ رمِ شرمِ جبینِ آشنا | گر نہ باندھے قلزمِ الفت میں سر جائے کدو
گرمیِ شوقِ طلب، ہے تیغِ تاپاکِ وصال | غافلاں، آئینہ داں ہے نقشِ پائے جستجو
رہنِ خاموشی ادا ہے، آرائشِ بزمِ وصال | ہے پرِ پروانہ رنگِ رفتۂ خوں، گفتگو

ہے تماشا، حیرت آبادِ تغافل ہائے شوق
یک رگِ خواب، و سراسر جوششِ خونِ آرزو

خوئے شرمِ سردبازاری، ہے سیلِ خانماں
ہے اسد، نقصاں میں منفعت اور صاحبِ سرمایہ تو

● ۱۸۱۶ء

اشکِ چکیدہ، رنگِ پریدہ
ہر طرح ہوں میں از خود رمیدہ

گو، یاد مجھ کو کرتے ہیں خوباں
لیکن بسانِ دردِ کشیدہ

ہے رشتۂ جاں فرطِ کشش سے
مانندِ نبضِ دستِ بریدہ

ٹوٹا ہے، افسوس! موئے خمِ زلف
ہے شانہ یکسر دستِ گزیدہ

خالِ سیاہِ رنگیں رخاں سے
ہے داغِ لالہ در خوں تپیدہ

جوشِ جنوں سے جوں کسوتِ گل
سرتا بپا ہوں جیبِ دریدہ

یارو، اسد کا نام و نشاں کیا؟
بیدل، فقیرِ آفت رسیدہ

خوشا طوطی و کنجِ آشیانہ
نہاں در زیرِ بال آئینہ خانہ

سرشکِ بر زمیں افتادہ آسا
اٹھایا یاں سے نہ میرا آب و دانہ

حریفِ عرضِ سوزِ دل نہیں ہے
زباں ہر چند ہو جاوے زبانہ

دلِ نالاں سے ہے بے پردہ پیدا
نوائے بربط و چنگ و چغانہ

کرے کیا دعویٔ آزادیٔ عشق
گرفتارِ الم ہائے زمانہ

اسد، اندیشۂ ششدر شدن ہے
نہ چھیڑے مہرہ ساں خانہ بخانہ

● ۱۸۱۶ء

رفتار سے شیرازۂ اجزائے قدم باندھ
اے آبلہ، محمل پئے صحرائے عدم باندھ

بیکاریِ تسلیم، بہر رنگ چمن ہے
گر خاک ہو، گلدستۂ صد نقشِ قدم باندھ

اے جادے، بسر رشتۂ یک ریشہ دویدن
شیرازۂ صد آبلہ جوں سبحہ، بہم باندھ

حیرت، حدِ اقلیمِ تمنائے پری ہے
آئینے پہ آئینِ گلستانِ ارم باندھ

پا مردِ یک انداز نہیں قامتِ ہستی
طاقت اگر اعجاز کرے، تہمتِ خم باندھ

دیباچۂ وحشت ہے، اسدؔ شکوۂ خوباں
خوں کر دلِ اندیشہ، و مضمونِ ستم باندھ

۱۸۱۶ء

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں، یک ورقِ گردانندہ

دیکھ کر بادہ پرستوں کی دل افسردگیاں
موجِ مے، مثلِ خطِ جام، ہے بر جا ماندہ

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت و بیاں
ہے سخن، گرد زِ داماںِ ضمیر افشاندہ

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے، ہر اک فرد، جہاں میں ورقِ ناخواندہ

حیف! بے حاصلیِ اہلِ ریا پر، غالب
یعنی ہیں ماندہ ازاں سو، وازیں سو راندہ

۱۸۱۶ء

بسکہ مے پیتے ہیں، اربابِ فنا پوشیدہ
خطِ پیمانۂ مے، ہے نفسِ دزدیدہ

بغرورِ طرحِ قامتِ رعنائیِ سرو
طوق، ہے گردنِ قمری میں رگِ بالیدہ

لی ہے وا اہلِ جہاں نے بگلستانِ جہاں
چشمِ غفلت نظر، شبنمِ خور نادیدہ

اے دریغا! کہ نہیں طبعِ نزاکت ساماں
ورنہ کانٹے میں تکے ہے سخنِ سنجیدہ

یاس آئینۂ پیدائیِ استغنا ہے
ناامیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالب
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

۱۸۱۶ء

از مہر تا بہ ذرہ دل، و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے، مقابل ہے آئینہ

حیرت، ہجومِ لذتِ غلطانیِ تپش
سیماب بالش، و کمرِ دل ہے آئینہ

غفلت، ببالِ جوہرِ شمشیر پرفشاں
یاں پشتِ چشمِ شوخیِ قاتل ہے آئینہ

حیرت نگاہ برق، تماشا بہارِ شوخ
در پردہ ہوا پرِ بسمل ہے آئینہ

یاں رہ گئے ہیں ناخنِ تدبیر ٹوٹ کر
جوہر طلسمِ عقدۂ مشکل ہے آئینہ

ہم زانوئے تامل، و ہم جلوہ گاہِ گل
آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ

دل کارگاہِ فکر، و اسد بنوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدل ہے آئینہ

● ۱۸۱۶ء

جوشِ دل ہے، مجھ سے حسنِ فطرتِ بیدل نپوچھ
قطرے سے میخانۂ دریائے بے ساحل نپوچھ

پہن گشتہائے دل، بزمِ نشاطِ گردباد
لذتِ عرضِ کشادِ عقدۂ مشکل نپوچھ

آبلہ، پیمانۂ اندازۂ تشویش تھا
اے دماغِ نارسا، خمخانۂ منزل نپوچھ

نے صبا بالِ پری، نے شعلہ سامانِ جنوں
شمع سے جز عرضِ افسونِ گدازِ دل نپوچھ

یک قطرہ برہم زدن، حشرِ دو عالم فتنہ ہے
یاں سراغِ عافیت، جز دیدۂ بسمل نپوچھ

بزم ہے یک پنبۂ مینا، گدازِ ربط سے
عیش کر، غافل، حجابِ نشۂ محفل نپوچھ

تا تکلف جامۂ شنگرفی ارزانی، اسد
شاعری جز سازِ درویشی نہیں، حاصل نپوچھ

● ۱۸۱۶ء

جز، دلِ سراغِ دردِ بدل خفتگاں نپوچھ
آئینہ عرض کر، خط و خالِ بیاں نپوچھ

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نپوچھ

پرواز، یک تپِ غمِ تسخیرِ نالہ ہے
گرمیِ نبضِ خار و خسِ آشیاں نپوچھ

تو مشقِ ناز کر، دلِ پروانہ ہے بہار
بیتابیِ تجلیِ آتش بجاں نپوچھ

غفلت متاعِ کفۂ میزانِ عدل ہوں
یارب، حسابِ سختیِ خوابِ گراں نپوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نپوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

۱۸۱۶ء

ضبط سے، جوں مردمک، اِسپند اقامت گیر ہے
مجمرِ بزمِ فسردن، دیدۂ نخچیر ہے

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل
یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ، بالِ تیر ہے

ہے جہاں نشکرِ کشیدنہائے نقشِ روئے یار
ماہتاب، ہالہ پیرا، گردۂ تصویر ہے

وقتِ حسن افروزیِ زینت طرازاں، جائے گل
ہر نہالِ شمع میں اک غنچۂ گل گیر ہے

گریے سے بندِ محبت میں ہوئی نام آوری
لختِ لختِ دل، نگیں خانۂ زنجیر ہے

ریزشِ خونِ وفا ہے، جرعہ نوشیہائے یار
یاں گلوئے شیشۂ مے، قبضۂ شمشیر ہے

جو بشامِ غم چراغِ خلوتِ دل تھا، اسد
وصل میں وہ سوزِ شمعِ مجلسِ تقریر ہے

کرے ہے رہروں سے خضرِ راہِ عشق جلّادی
ہوا ہے موجۂ ریگِ رواں شمشیرِ فولادی

نظر بندِ تصور ہے قفس میں لطفِ آزادی
شکستِ آرزو کے رنگ کی کرتا ہوں صیّادی

کرے ہے حسنِ ویراں کار روئے سادہ رویاں پہ
غبارِ خط سے تعمیرِ بنائے خانہ بربادی

چنار آسا عدم سے بادلِ پُر آتش آیا ہوں
تہی آغوشیِ دستِ تمنا کا ہوں فریادی

اسد، از بسکہ فوجِ درد و غم سرگرمِ جولاں ہے
غبارِ راہ ویرانی ہے ملکِ دل کی آبادی

۱۸۱۶ء

یہ سرنوشت میں میری ہے، اشک افشانی
کہ موجِ آب ہے، ہر ایک چینِ پیشانی

جنونِ وحشتِ ہستی یہ عام ہے کہ بہار
دکھے ہے کسوتِ طاؤس میں پر افشانی

لبِ نگار میں آئینہ دیکھ، آبِ حیات
بہ گرہیِ سکندر ہے محوِ حیرانی

نظر بہ غفلتِ اہلِ جہاں ہوا ظاہر
کہ عیدِ خلق پہ حیراں ہے چشمِ قربانی

کہوں وہ مصرعِ برجستہ وصفِ قامت میں
کہ سرو ہو نہ سکے اُس کا مصرعِ ثانی

اسدؔ نے کثرتِ دل ہائے خلق سے جانا
کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

۱۸۱۶ء

ہے آرمیدگی میں نکوہش، بجا مجھے م
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈھے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی م
جس کی صدا، ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال م
تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے

کرتا ہے، بسکہ باغ میں تو، بے حجابیاں م
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟ م
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ہے پیچ تابِ رشتۂ شمعِ سحر گہی
خجلت گدازیِ نفسِ نارسا مجھے

واں رنگہا بہ پردۂ تدبیر ہیں ہنوز
یاں شعلۂ چراغ ہے، برگِ حنا مجھے

پرواز ہا، نیازِ تماشائے حسنِ دوست
بالِ کشادہ ہے، نگہِ آشنا مجھے

از خود گزشتگی میں خموشی پہ حرف ہے
موجِ غبارِ سرمہ ہوئی ہے صدا مجھے

تا چند پست فطرتیِ طبعِ آرزو؟
یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

یاں آب و دانہ، موسمِ گل میں، حرام ہے
زُنّار واگسستہ ہے، موجِ صبا مجھے

یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق، بادۂ مرد آزما مجھے

میں نے جنوں سے کی جو، اسدؔ، التماسِ رنگ
خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

۱۸۱۶ء

ہر رنگِ سوز، پردۂ یک ساز ہے مجھے
بالِ سمندر، آئنۂ ناز ہے مجھے

طاؤسِ خاک، حسنِ نظر باز ہے مجھے
ہر ذرّہ، چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے

آغوشِ گل ہے آئنۂ ذرّہ ذرّہ خاک
عرضِ بہار، جوہرِ پرواز ہے مجھے

ہے بوئے گل غریبِ تسلی گرِ وطن
ہر جزو آشیاں، پرِ پرواز ہے مجھے

ہے جلوۂ خیال، سویدائے مردمک
جوں داغ، شعلہ سرِ خطِ آغاز ہے مجھے

وحشت بہارِ نشہ، و گل ساغرِ شراب
چشمِ پری، شفقکدۂ راز ہے مجھے

فکرِ سخن، بہانۂ پروازِ خامشی
دودِ چراغ، سرمۂ آواز ہے مجھے

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بکف، اسدؔ
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

١٨١٦ء

کہوں کیا گرمجوشی میکشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمعِ خانۂ دل، آتشِ مے سے فروزاں کی

بزلفِ مہ وشاں، رہتی ہے، شبِ بیدار، ظاہر ہے
زبانِ شانہ سے تعبیرِ صد خوابِ پریشاں کی

ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں، لوحِ دبستاں کی

دریغ! آہِ سحر گہ کارِ بادِ صبح کرتی ہے
کہ ہوتی ہے زیادہ، سرد مہری شمع رویاں کی

مجھے اپنے جنوں کی، بے تکلف، پردہ داری تھی
ولیکن کیا کروں، آوے جو رسوائی گریباں کی

ہنر پیدا کیا ہے میں نے، حیرت آزمائی میں
کہ جوہر آئنے کا، ہر پلک، ہے، چشمِ حیراں کی

خدایا، کس قدر اہلِ نظر نے خاک چھانی ہے!
کہ ہیں صد رخنہ، جوں غربال، دیواریں گلستاں کی

ہوا شرم تہیدستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس، اے زخمِ جگر، اب دیکھ لی شورش نمکداں کی

بیادِ گرمیِ صحبت، برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر، غالبؔ، سوزشیں داغِ نمایاں کی

١٨١٦ء

جنوں، تہمت کشِ تسکیں نہو، گر شادمانی کی م
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذت زندگانی کی

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی م
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی

پس از مردن بھی، دیوانہ، زیارتگاہِ طفلاں ہے م
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

نہ کھینچ، اے دستِ سعیِ نارسا، زلفِ تمنا کو
پریشاں تر ہے موئے خامہ سے تدبیر مانی کی

کہاں ہم بھی رگ و پے رکھتے ہیں، انصاف بہتر ہے
نہ کھینچے، طاقتِ خمیازہ، تہمت ناتوانی کی

تکلف برطرف، فرہاد اور اتنی سبک دستی
خیال آساں تھا، لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے، شرارت نوجوانی کی

۱۸۱۶ء

نکوہش، ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی م
مبادا، خندۂ دنداں نما ہو، صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو، خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے م
اگر بو دے بجائے دانہ، دہقاں، نوکِ نشتر کی

پرِ پروانہ، شاید، بادبانِ کشتیِ مے تھا م
ہوئی مجلس کی گرمی سے، روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت! م
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے، میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے، قیامت ہے! م
مری قسمت میں یارب، کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

تھکا جب قطرۂ بے دست و پا بالا دویدن سے
زہے یادگاری ہا گرہ دیتا ہے گوہر کی

بجز دیوانگی ہوتا نہ انجامِ خود آرائی
اگر پیدا نہ کرتا آئنہ زنجیر جوہر کی

مرا دل مانگتے ہیں عاریت اہلِ ہوس، شاید
یہ جایا چاہتے ہیں آج دعوت میں سمندر کی

غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بیباکیِ مستاں
نمِ دامانِ عصیاں ہے، طراوت موجِ کوثر کی

اسد، جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا!
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں، گر، کشتی سکندر کی

آنکھوں میں انتظار سے جاں پر شتاب ہے
آتا ہے آ، وگرنہ یہ یادِ رکاب ہے

حیراں ہوں، دامنِ رشحہ کیوں جھاڑتا نہیں
خطِ صفحۂ عذار پہ گردِ کتاب ہے

جوں نخلِ ماتم، ابر سے مطلب نہیں مجھے
رنگِ سیاہ نیل، غبارِ سحاب ہے

ممکن نہیں کہ ہو دلِ خوباں میں کارگر
تاثیر جستنِ اشک سے نقشِ برآب ہے

ظاہر ہے، طرزِ قید سے، صیاد کی غرض
جو دانہ دام میں ہے، سو اشکِ کباب ہے

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

دیکھ، اے اسدؔ، بدیدۂ باطن کہ ظاہرا
ہر ایک ذرہ غیرتِ صد آفتاب ہے

۱۸۱۶ء

بے خود، زبسکہ خاطرِ بیتاب ہو گئی
مژگانِ باز ماندہ، رگِ خواب ہو گئی

موجِ تبسمِ لبِ آلودۂ مسی
میرے لیے تو تیغِ سیہ تاب ہو گئی

رخسارِ یار کی جو کھلی جلوہ گستری
زلفِ سیاہ بھی، شبِ مہتاب ہو گئی

بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لا سکی
اے جانِ برلب آمدہ، بیتاب ہو گئی

غالبؔ، زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

۱۸۱۶ء

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے م
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی، نازِ خود بینی
تکلف برطرف، آئینۂ تمییز حائل ہے

بہ سیلِ اشک، لختِ دل ہے دامن گیر مژگاں کا
غریقِ بحر، جویائے خس و خاشاکِ ساحل ہے

بہا ہے یاں تک اشکوں میں، غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں، ہر اک پارۂ دل، پائے در گل ہے

نکلتی ہے تپش میں بسملوں کی، برق کی شوخی
غرض اب تک خیالِ گرمیِ رفتارِ قاتل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی م
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے، غالبؔ م
چٹکنا غنچۂ گل کا، صدائے خندۂ دل ہے

۱۸۱۶ء

جنوں رسوائیِ وارستگی، زنجیر بہتر ہے — بقدرِ مصلحت دل بستگی، تدبیر بہتر ہے
خوشا! خود بینی و تدبیرِ غفلت نقد اندیشہ — بدینِ عجز اگر بدنامیِ تقدیر بہتر ہے
کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو — تکلف برطرف، تجھ سے تری تصویر بہتر ہے
دلِ آگاہ تسکیں خیزِ بیدردی ہو، یارب! — نفس، آئینہ دارِ آہِ بے تاثیر بہتر ہے
خلا یا چشم تا دل درد ہے، افسونِ آگاہی! — نگہ، حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے
درونِ جوہرِ آئینہ، جوں برگِ حنا خوں ہے — بتاں، نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے
تمنا ہے، اسدؔ، قتلِ رقیب اور شکر کا سجدہ — دعائے دل، بمحرابِ خمِ شمشیر بہتر ہے

۱۸۱۶ء

مژہ، پہلوئے چشم، اے جلوۂ ادراک باقی ہے — ہوا وہ شعلہ داغ، اور شوخیِ خاشاک باقی ہے
چمن میں کچھ نہ چھوڑا تو نے غیر از بیضۂ قمری — عدم میں، بہرِ فرقِ سرو، مشتِ خاک باقی ہے
گدازِ سعیِ بینش، شست و شوئے نقشِ خود کامی — سراپا شبنم آئینۂ یک نگاہِ پاک باقی ہے
ہوا ترکِ لباسِ زعفرانی دلکشا، لیکن — ہنوز آفت کمینِ یک خندہ، یعنی چاک باقی ہے
چمن زارِ تمنا ہو گئی صرفِ خزاں، لیکن — بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرت ناک باقی ہے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں، غالبؔ، گردشِ افلاک باقی ہے

۱۸۱۶ء

خموشیوں میں "تماشا ادا" نکلتی ہے م — نگاہ، دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے، بنتی ہے شبنم م — صبا، جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ م — کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

بہارِ شوخ، و چمن تنگ، و رنگِ گل دلچسپ — نسیم، باغ سے پا در حنا نکلتی ہے
بحلقۂ خمِ گیسو ہے راستی آموز — دہانِ مار سے گویا صبا نکلتی ہے
برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی — کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے
اسدؔ کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل — ہنوز، یک سخنِ بے صدا نکلتی ہے

● ۱۸۱۶ء

زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے — م — کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے
بجانوں، کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی — م — تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ — م — نگاہِ عجز، سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل، و دعوائے عشق بے بنیاد — م — جنونِ ساختۂ و فصلِ گل، قیامت ہے
اسدؔ، بہارِ تماشائے گلستانِ حیات — وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

● ۱۸۱۶ء

ترجبیں رکھتی ہے، شرمِ قطرہ سامانی مجھے — موجِ گردابِ حیا ہے، چینِ پیشانی مجھے
شبنم آسا کو مجالِ سبحہ گردانی ہے مجھے؟ — ہے، شعاعِ مہر، زنّارِ سلیمانی مجھے
بلبلِ تصویر ہوں بیتابِ اظہارِ تپش — جنبشِ نالِ قلم، جوشِ پر افشانی مجھے
ضبطِ سوزِ دل ہے وجہِ حیرتِ اظہارِ حال — داغ ہے مُہرِ دہن، جوں چشمِ قربانی مجھے
شوخ، ہے مشقِ حجاب از خویش بیروں آمدن — ہے گریباں گیرِ فرصت، ذوقِ عریانی، مجھے
وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تارِ نفس — ناخنِ بُریدہ ہے تیغِ صفاہانی مجھے
ہوں، ہیولائے دو عالم، صورتِ تقریر، اسدؔ — فکر نے سونپی خموشی کی گریبانی مجھے

● ۱۸۱۶ء

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

ہم زباں آیا نظر فکرِ سخن میں تو مجھے
مردمک، ہے طوطیِ آئینۂ زانو مجھے

خاکِ فرصت بر سرِ ذوقِ فنا! اے انتظار
ہے، غبارِ شیشۂ ساعت، رمِ آہو مجھے

یادِ مژگاں میں، بہ نشتر زارِ سودائے خیال
چاہیے، وقتِ تپش، یکدست صد پہلو مجھے

کثرتِ جور و ستم سے، ہو گیا ہوں بے دماغ
خوب رویوں نے بنایا عاقبت بدخو مجھے

اضطرابِ عمر بے مطلب نہیں آخر، کہ ہے
جستجوئے فرصتِ ربطِ سرِ زانو مجھے

چاہیے درمانِ ریشِ دل بھی تیغِ یار سے
مرہمِ زنگار ہے وہ وسمۂ ابرو مجھے

م پا بدامن ہو رہا ہوں، بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

م دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو، مجھے

م ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

فرصت آرامِ غش، ہستی ہے، بحرانِ عدم
ہے شکستِ رنگِ امکاں، گردشِ پہلو مجھے

سازِ ایمائے فنا ہے عالمِ پیری، اسد
قامتِ خم سے ہے حاصل شوخیِ ابرو مجھے

۱۸۱۶ء

م یاد ہے، شادی میں بھی، ہنگامۂ "یارب" مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے

م ہے کشادِ خاطرِ وابستہ، در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

م یارب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے!
رشک، آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

م طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں!
آرزو سے ہے شکستِ آرزو، مطلب مجھے

صبح، ناپیدا ہے کلفت خانۂ ادبار میں
توڑنا ہوتا ہے رنگِ یک نفس، ہر شب مجھے

شومیِ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر
نامۂ اعمال ہے، تاریکیِ کوکب مجھے

دردنا پیدا، و بیجا تہمتِ دارستگی
پردہ دارِ یاوگی ہے، وسعتِ مشرب مجھے

م دل لگا کر آپ بھی، غالب! مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

۱۸۱۶ء

کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے
ناخنِ انگشتِ خوباں، نعلِ واژوں ہے مجھے

ریشۂ شہرت دوانیدن ہے، رفتن زیرِ خاک
خنجرِ جلاد، برگِ بیدِ مجنوں، ہے مجھے

ساقیا! دے ایک ہی ساغر میں سب کو مَے، کہ آج
آرزوئے بوسۂ لبہائے میگوں ہے مجھے

ہو گئے باہم دگر، جوشِ پریشانی سے، جمع
گردشِ جامِ تمنا، دورِ گردوں، ہے مجھے

دیکھی جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کے مانند، کاہش روز افزوں ہے مجھے

غنچگی ہے، بر نفس پیچیدنِ فکر، اے اسد
وا شگفتنہائے دل در رہنِ مضموں ہے مجھے

۱۸۱۶ء

دیکھ تری خوئے گرم، دل بہ تپش رام ہے
طائرِ سیماب کو، شعلہ، رگِ دام ہے

شوخیِ چشمِ حبیب، فتنۂ ایام ہے
قسمتِ بختِ رقیب، گردشِ صد جام ہے

جلوہ، بینش پناہ، بخشے ہے ذوقِ نگاہ
کعبۂ پوشش سیاہ، مردمکِ احرام ہے

گو نفس؟ دحیہ غبار؟ جرأتِ عجز آشکار
در تپش آبادِ شوق، سرمہ، صدا نام ہے

غفلتِ افسردگی، تہمتِ تمکیں نہ ہو
اے ہمہ خوابِ گراں، حوصلہ بدنام ہے

بزمِ دِ داغِ نظر، یاسِ طرب نامہ بر
فرصتِ رقصِ شرر، بوسہ بہ پیغام ہے

گریۂ طوفاں رکاب، نالۂ محشر عناں
بے سر و ساماں اسد، فتنہ سر انجام ہے

۱۸۱۶ء

بسکہ سودائے خیالِ زلف وحشت ناک ہے
تا دلِ شب، آبنوسی شانہ آسا، چاک ہے

یاں، فلاخن باز، کس کا نالۂ بیباک ہے؟
جادہ، تا کہسار، موئے چینیِ افلاک ہے

ہے دو عالم صیدِ اندازِ نشہ دلدل سوار
یاں، خطِ پرکارِ ہستی، حلقۂ فتراک ہے

خلوتِ بالِ دو پرِ قمری میں وا کر راہِ شوق
جادۂ گلشن، برنگِ ریشہ، زیرِ خاک ہے

عیش گرمِ اضطراب، داہلِ غفلت سرد مہر — دورِ ساغر، یک گلستاں برگریزِ تاک ہے
عرضِ وحشت پر ہے، نازِ ناتوانی ہائے دل — شعلۂ بے پردہ، چینِ دامنِ خاشاک ہے
ہے کمندِ موجِ گل، فتراکِ بے تابی، اسدؔ — رنگ، یاں بُو سے، سوارِ توسنِ چالاک ہے

● ۱۸۱۶ء

چشمِ خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے م سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
ہے صریرِ خامہ، ریزشہائے استقبالِ ناز — نامہ خود پیغام کو بال و پرِ پرواز ہے
پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے م نالہ، گویا، گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا م یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے
سرنوشتِ اضطراب انجامیِ الفت نہ پوچھ — نالِ خامہ، خار خارِ خاطرِ آغاز ہے
نغمہ ہے کانوں میں اُس کے، نالۂ مرغِ اسیر — رشتۂ پا، یاں نوا سامانِ بندِ ساز ہے
شرم ہے طرزِ تلاشِ انتخابِ یک نگاہ — اضطرابِ چشمِ برپا دوختہ، غماز ہے
نقشِ سطرِ صد تبسم ہے برآبِ زیرِ گاہ — حُسن کا خطِ بر نہاں خندیدنی انداز ہے
شوخیِ اظہار غیراز وحشتِ مجنوں نہیں — لیلیِ معنی، اسدؔ، محمل نشینِ راز ہے

● ۱۸۱۶ء

بسکہ حیرت سے ز پا افتادۂ زنہار ہے — ناخنِ انگشت، تبخالِ لبِ بیمار ہے
زلف سے شب درمیاں دادن نہیں ممکن، دریغ! — ورنہ، صد محشر برہنِ جلوۂ رخسار ہے
در خیال آبادِ سودائے سرِ مژگانِ دوست — صد رگِ جاں، جادہ آسا، وقفِ نشتر زار ہے
بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر — گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے
اے سرِ شوریدہ، ذوقِ عشق و پاسِ آبرو! — جوشِ سودا کب حریفِ منتِ دستار ہے!
وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے، مگر — فتنہ، تاراجِ تمنا کے لیے درکار ہے
خانماں ہا، پائمالِ شوخیِ دعویٰ، اسدؔ — سایۂ دیوار، سیلابِ در و دیوار ہے

۱۸۱۶ء

کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے
ناخنِ انگشتِ خوباں، نعلِ واژوں ہے مجھے

ریشۂ شہرت دوانیدن ہے، رفتن زیرِ خاک
خنجرِ جلاد، برگِ بیدِ مجنوں، ہے مجھے

ساقیا! دے ایک ہی ساغر میں سب کو، کہ آج
آرزوئے بوسۂ لبہائے میگوں ہے مجھے

ہو گئے باہم دگر، جوشِ پریشانی سے، جمع
گردشِ جامِ تمنا، دورِ گردوں، ہے مجھے

دیکھ لی جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کے مانند، کاہش روز افزوں ہے مجھے

غنچگی ہے، بر نفس پیچیدنِ فکر، اے اسد
واشگفتنہائے دل در رہنِ مضموں ہے مجھے

۱۸۱۶ء

دیکھ تری خوئے گرم، دل بہ تپش رام ہے
طائرِ سیماب کو، شعلہ، رگِ دام ہے

شوخیِ چشمِ حبیب، فتنۂ ایام ہے
قسمتِ بختِ رقیب، گردشِ صد جام ہے

جلوۂ بینش پناہ، بخشے ہے ذوقِ نگاہ
کعبۂ پوشش سیاہ، مردمکِ احرام ہے

گو نفس؟ و چہ غبار؟ جراتِ عجز آشکار
در تپش آبادِ شوق، سرمہ، صدا نام ہے

غفلتِ افسردگی، تہمتِ تمکیں نہ ہو
اے ہمہ خوابِ گراں، حوصلہ بدنام ہے

بزمِ وداعِ نظر، یاس طرب نامہ بر
فرصتِ رقصِ شرر، بوسہ بہ پیغام ہے

گریۂ طوفاں رکاب، نالۂ محشر عناں
بے سر و ساماں اسد، فتنہ سرانجام ہے

۱۸۱۶ء

بسکہ سودائے خیالِ زلف وحشت ناک ہے
تا دلِ شب، آبنوسی شانہ آسا چاک ہے

یاں، فلاخن باز، کس کا نالۂ بیباک ہے؟
جادہ، تا کہسار، موئے چینیِ افلاک ہے

ہے دو عالم صیدِ اندازِ نشۂ دلدل سوار
یاں، خطِ پرکارِ ہستی، حلقۂ فتراک ہے

خلوتِ بال و پرِ قمری میں وا کر راہِ شوق
جادۂ گلشن، بہ رنگِ ریشہ، زیرِ خاک ہے

عیش گرمِ اضطراب، واہلِ غفلت سرد مہر
دورِ ساغر، یک گلستاں برگریزِ تاک ہے

عرضِ وحشت پر ہے، نازِ ناتوانی ہائے دل
شعلۂ بے پردہ، چینِ دامنِ خاشاک ہے

ہے کمندِ موجِ گل، فتراکِ بے تابی، اسدؔ
رنگ، یاں بو سے، سوارِ توسنِ چالاک ہے

۱۸۱۶ء

م چشمِ خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

ہے صریرِ خامہ، ریزشہائے استقبالِ ناز
نامہ خود پیغام کو بال و پرِ پرواز ہے

م پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ، گویا، گردشِ سیارہ کی آواز ہے

م دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے

سرنوشتِ اضطراب انجامیِ الفت نہ پوچھ
نالِ خامہ، خارِ خارِ خاطرِ آغاز ہے

نغمہ ہے کانوں میں اُس کے، نالۂ مرغِ اسیر
رشتۂ پا، یاں نوا سامانِ بندِ ساز ہے

شرم ہے طرزِ تلاشِ انتخابِ یک نگاہ
اضطرابِ چشمِ برپا دوختہ، غمّاز ہے

نقشِ سطرِ صد تبسم ہے برآبِ زیرِ گاہ
حُسن کا خطِ برنہاں خندیدنی انداز ہے

شوخیِ اظہار غیراز وحشتِ مجنوں نہیں
لیلیِ معنی، اسدؔ، محمل نشینِ راز ہے

۱۸۱۶ء

بسکہ حیرت سے زپا افتادۂ زنہار ہے
ناخنِ انگشت، تبخالِ لبِ بیمار ہے

زلف سے شب درمیاں دادن نہیں ممکن، دریغ!
ورنہ، صد محشر برہنِ جلوۂ رخسار ہے

درخیال آبادِ سودائے سرِ مژگانِ دوست
صد رگِ جاں، جادہ آسا، وقفِ نشتر زار ہے

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر
گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنّار ہے

اے سرِ شوریدہ، ذوقِ عشق و پاسِ آبرو!
جوشِ سودا کب حریفِ منتِ دستار ہے؟

وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے، مگر
فتنہ، تاراجِ تمنا کے لیے درکار ہے

خانماں ہا، پائمالِ شوخیِ دعوی، اسدؔ
سایۂ دیوار، سیلابِ در و دیوار ہے

۱۸۱۶ء

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے — م — بے تکلف، اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے؟
از دلِ ہر دردمندے جوشِ بیتابی زدن — اے ہمہ بے مدعائی، یک دعا ہو جائیے
بیضہ آسا، تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس — م — از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے!
یاد رکھیے نازہائے التفاتِ اولیں — آشیانِ طائرِ رنگِ حنا ہو جائیے!
لطفِ عشقِ ہر یک اندازِ دگر دکھلائے گا — بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے
داد از دستِ جفائے صدمۂ ضربُ المثل! — گر ہمہ افتادگی، جوں نقشِ پا ہو جائیے
وسعتِ مشرب، نیازِ کلفتِ وحشت، اسدؔ — یک بیاباں سایۂ بالِ ہما ہو جائیے

۱۸۱۶ء

کوشش، ہمہ بیتاب ترددشکنی ہے — صد جنبشِ دل، یک مژہ برہم زدنی ہے
گو حوصلہ پامردِ تغافل نہیں، لیکن — خاموشیٔ عاشق، گلۂ کم سخنی ہے
دی لطفِ ہوائے جنوں، طرفہ نزاکت — تا آبلہ، دعوائے تنک پیرہنی ہے
راہشگرِ اربابِ فنا، نالۂ زنجیر — عیشِ ابد، از خویش بروں تاختنی ہے
از بسکہ ہے محوِ چمن تکیہ زدنہا — گل برگ، پرِ بالشِ سروِ چمنی ہے
آئینہ و شانہ، ہمہ دست و ہمہ زانو — اے حسن، مگر حسرتِ پیماں شکنی ہے
فریاد، اسدؔ، بے نگہی ہائے بتاں سے — پر سچ کہتے ہیں، واللہ، کہ اللہ غنی ہے

۱۸۱۶ء

کاشانۂ ہستی کہ برانداختنی ہے — یاں سوختنی، اور وہاں ساختنی ہے
ہے شعلۂ شمشیرِ فنا، حوصلہ پرداز — اے داغِ تمنا، سپر انداختنی ہے
عجز خاک بسر کردنِ بے فائدہ حاصل؟ — ہر چند بمیدانِ ہوس تاختنی ہے

اے بے ثمراں، حاصلِ تکلیفِ دمیدن
گردن، بہ تماشائے گل، افراختنی ہے

ہے سادگیِ ذہن، تمنائے تماشا
جائے کہ، اسدؔ، رنگِ چمن باختنی ہے

● ۱۸۱۶ء

حکم بیتابی نہیں، اور آرمیدن منع ہے
باوجودِ مشقِ وحشتہا، رمیدن منع ہے

شرم، آئینہ تراشِ جبہۂ طوفان ہے
آب گردیدن روا، لیکن چکیدن منع ہے

بیخودی، فرماں روائے حیرت آبادِ جنوں
زخم دوزی جرم، و پیراہن دریدن منع ہے

مژدۂ دیدار سے رسوائیِ اظہار دور
آج کی شب، چشمِ کوکب تک پریدن منع ہے

بیم طبعِ نازکِ خوباں سے، وقتِ سیرِ باغ
ریشۂ زیرِ زمیں کو بھی دویدن منع ہے

یار معذورِ تغافل ہے، عزیزاں شفقتے!
نالۂ بلبل بگوشِ گل شنیدن منع ہے

مانعِ بادہ کشی ناداں ہے، لیکن، اسدؔ
بے ولائے ساقیِ کوثر کشیدن منع ہے

● ۱۸۱۶ء

چار سوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے
نقد ہے داغِ دل، اور آتش زبانی مفت ہے

زخمِ دل پر باندھیے حلوائے مغزِ استخواں
تندرستی فائدہ، اور ناتوانی مفت ہے

نقدِ انجم تا کجے از کیسہ بیروں ریختن؟
یعنی، اے پیرِ فلک، شامِ جوانی مفت ہے

گر نہیں پاتا درونِ خانہ، ہر بیگانہ، جا
بر درِ نکشودۂ دل، پاسبانی مفت ہے

چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بر ہوس ہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے

یک نفس، ہر یک نفس، جاتا ہے قطعِ عمر میں
حیف ہے اُن کو جو سمجھیں زندگانی مفت ہے

مال و جاہ و دست و پا بے زر خریدہ ہیں، اسدؔ
پس بدل ہائے دگر راحت رسانی مفت ہے

● ۱۸۱۶ء

بیتابیِ یادِ دوست، ہمرنگِ تسلّی ہے
غافل، تپشِ مجنوں، محمل کشِ لیلیٰ ہے

کلفت کشیِ ہستی، بدنامِ دو رنگی ہے / یاں تیرگیِ اختر، خالِ رخِ زنگی ہے
دیدن ہمہ بالیدن، کردن ہمہ افسردن / خوشتر ز گل و غنچہ، چشم و دلِ ساقی ہے
وہمِ طربِ ہستی، ایجادِ سیہ مستی / تسکیں دہِ صد محفل، یک ساغرِ خالی ہے
زندانِ تحمل میں مہمانِ تغافل ہیں / بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے
ہووے نہ غبارِ دلِ تسلیم زمیں گیراں / مغرور نہو، ناداں، سرتا سرِ گیتی ہے
رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے، غالب / یاں زورقِ خود داری، طوفانیِ معنی ہے

● ۱۸۱۶ء

گلشن کو تری صحبت، ازبسکہ خوش آئی ہے / م / ہر غنچے کا گل ہونا، آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر / م / یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے / م / جو داغ نظر آیا، اک چشم نمائی ہے
آئینہ، نفس سے بھی ہوتا ہے کدورت کش / عاشق کو غبارِ دل، اک وجہِ صفائی ہے
ہنگامِ تصور ہوں دریوزہ گرِ بوسہ / یہ کاسۂ زانو بھی اک جامِ گدائی ہے
وہ دیکھ کے حسن اپنا، مغرور ہوا، غالب / صد جلوۂ آئینہ، یک صبحِ جدائی ہے

● ۱۸۱۶ء

دریوزۂ ساماں ہا، اے بے سروسامانی / ایجادِ گریباں ہا، در پردۂ عریانی
تمثالِ تماشاہا، اقبالِ تمنا ہا / عجزِ عرقِ شرمے، اے آئنہ حیرانی
دعوائے جنوں باطل، تسلیم عبث حاصل / پروازِ فنا مشکل، میں عجزِ تن آسانی
بے گانگیِ خوہا، موجِ رمِ آہو ہا / دامِ گلۂ الفت، زنجیرِ پشیمانی
پروازِ تپش رنگی، گلزارِ ہمہ تنگی / خوں ہوں قفسِ دل میں، اے ذوقِ پریشانی
سنگ آمد و سخت آمد، دردِ سرِ خود داری / معذورِ سبک ساری، مجبورِ گرانجانی
گلزارِ تمنا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں / صد نالہ اسد، بلبل در بندِ زباں دانی

نظر بہ نقصِ گدایاں، کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعویِ چمن نسبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے

خوشا! وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو
جنونِ یاس و الم، رزقِ مدعا طلبی ہے

چمن میں کس کی، یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟
کہ برگ برگِ سمن، شیشہ ریزۂ حلبی ہے

امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
علیؑ، ولی، اسد اللہ، جانشینِ نبیؐ ہے

● ۱۸۱۶ء

دلا، عبث ہے تمنائے خاطر افروزی
کہ بوسۂ لبِ شیریں ہے اور گلو سوزی

طلسمِ آئنہ، زانوے فکر ہے، غافل
ہنوز حسن کو ہے، سعیِ جلوہ اندوزی

ہوئی ہے سوزشِ دل، بسکہ، داغِ بے اثری
اگی ہے دودِ جگر سے شبِ سیہ روزی

بہ پرفشانیِ پروانہ، چراغِ مزار!
کہ بعدِ مرگ بھی ہے لذتِ جگر سوزی

تپش تو کیا، ہوئی مشقِ پرفشانی بھی
رہا ہیں ضعف سے شرمندۂ نو آموزی

اسد، ہمیشہ پئے کفشِ پائے سیم تناں
شعاعِ مہر سے کرتا ہے چرخ زردوزی

● ۱۸۱۶ء

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

نفس بہ نالہ رقیب، و نگہ باشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

بہ کسوتِ عرقِ شرم قطرہ زن ہے خیال
مباد، حوصلہ معذورِ جستجو جانے

جنوں فسردۂ تمکیں ہے، کاش! عہدِ وفا
گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے

نہ ہووے کیونکہ اسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا
لہو ہیں ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے

زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ برانداز گفتگو جانے

مسیحِ کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو، اسد، تپشِ نبضِ آرزو جانے

۱۸۱۶ء

اگر گل حسن و الفت کی بہم جوشیدنی جانے
پرِ بلبل کے افسردن کو دامن چیدنی جانے

فسونِ حسن سے ہے، شوخیِ گلگونہ آرائی
بہار، اُس کی کفِ مشاطہ میں بالیدنی جانے

نوائے بلبل و گل، پاسبانِ بیدماغی ہے
بیک مژگانِ خوباں، صد چمن خوابیدنی جانے

زہے! شبِ زندہ دارِ انتظارستاں، کہ وحشت سے
مژہ، یک چشمک میں مہ کی سوزن آسا، چیدنی جانے

خوشا! مستی، کہ جوشِ حیرت اندازِ قاتل سے
نگہ، شمشیر میں جوں جوہر، آرامیدنی جانے

جفا شوخ، و ہوس گستاخ مطلب ہے، مگر عاشق
نفس، در قالبِ خشتِ لحد دزدیدنی جانے

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے
تماشا ہے کہ رنگِ رفتہ برگردیدنی جانے

اسد، جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو، حالِ دل پرسیدنی جانے

۱۸۱۶ء

گلستاں، بے تکلف پیشِ پا افتادہ مضموں ہے
جو تو باندھے کفِ پا پر حنا، آئینہ موزوں ہے

بہارِ گل دماغِ نشۂ ایجادِ مجنوں ہے
ہجومِ برق سے، چرخ و زمیں، یک قطرۂ خوں ہے

ہجومِ گریہ، سوئے دل، خوشا! سرمایۂ طوفاں
بر انگشتِ حسابِ اشک، ناخن، نعلِ وارژوں ہے

عدم وحشت سراغ، و ہستی آئینہ بندِ رنگینی
دماغِ دو جہاں پر، سنبل و گل، یک شبیخوں ہے

تماشا ہے علاجِ بیدماغیہائے دل، غافل
سویدا مردمِ چشمِ پری، نظارہ افسوں ہے

فنا، کرتی ہے زائل سرنوشتِ کلفتِ ہستی
سحر از بہرِ شست و شوئے داغِ ماہ، صابوں سا ہے

اسد، ہے آج مژگانِ تماشا کی خنابندی
چراغانِ نگاہ، و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے

۱۸۱۶ء

صبح سے معلوم، آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں، آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے

بلکہ ہے صیاد راہِ عشق میں محوِ کمیں
جادۂ رہ سر بسر، مژگانِ چشمِ دام ہے

بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بُتِ خورشید طلعت، آفتابِ بام ہے

مستعدِّ قتلِ یک عالم ہے، جلّادِ فلک
کہکشاں، موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں ملے
پختگی ہائے تصوّر، یاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں، وہ ساقیِ خورشید رو، مجلس فروز
واں، اسدؔ، تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

● ۱۸۱۶ء

دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے
فالِ رسوائی، سرشکِ سر بصحرا دادہ سے

دام گر سبزے میں پنہاں کیجیے، طاؤس ہو
جوشِ نیرنگِ بہارِ عرضِ صحرا دادہ سے

خیمۂ لیلیٰ سیاہ، و خانۂ مجنوں خراب
جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغ بیروں دادہ سے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
م نقشِ پا، جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے، وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟
م شیشے میں، نبضِ پری، پنہاں ہے موجِ بادہ سے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم، اسدؔ
دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

● ۱۸۱۶ء

اے خیالِ وصل، نادر ہے مے آشامی تری
پختگی ہائے کبابِ دل ہوئی خامی تری

رچ گیا جوشِ صفائے زلف کا، اعضا میں، عکس
ہے نزاکت جلوہ، اے ظالم، سیہ فامی تری

برگ ریزی ہائے گُل، ہے وضعِ زر افشاندنی
باج لیتی ہے گلستاں سے گُل اندامی تری

بسکہ ہے عبرت ادیب، یادگیہائے ہوس
میرے کام آئی، دلِ مایوس ناکامی تری

ہم نشینیِ رقیباں، گرچہ، ہے سامانِ رشک
لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری

مجھ کو، اے غفلت نسب، پروائے مشتاقاں کہاں!
یاں نگہ آلودہ ہے دستارِ بادامی تری

سر بزانوے کرم رکھتی ہے شرمِ ناکسی
اے اسدؔ، بیجا نہیں ہے غفلت آرامی تری

● ۱۸۱۶ء

چشمِ گریاں، بسملِ شوقِ بہارِ دید ہے — اشک ریزی، عرضِ بال افشانیِ اُمید ہے
دامنِ گردوں میں رہ جاتا ہے ہنگامِ وداع — گوہرِ شب تاب، اشکِ دیدۂ خورشید ہے
رتبۂ تسلیمِ خلقت مشرباں، عالی سمجھ — چشمِ قربانی، گلِ شاخِ ہلالِ عید ہے
کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کشمکش — اے خوشا رندے کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے
کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے، اسدؔ — یا علی، وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

● ١٨١٦ء

دل سراپا وقفِ سودائے نگاہِ تیز ہے — یہ زمیں، مثلِ نیستاں، سختِ ناوک خیز ہے
ہو سکے کیا خاک دستِ بازوئے فرہاد سے؟ — بیستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے
ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں، زبس، تیرِ نگاہ — پردۂ بادام، یک غربالِ حسرت بیز ہے
خوں چکاں ہے جادہ، مانندِ رگِ سودائیاں — سبزۂ صحرائے الفت، نشترِ خوں ریز ہے
ہے بہارِ تیز رَو، گلگونِ نکہت پر سوار — یک شکستِ رنگِ گل، صد جنبشِ مہمیز ہے
کیوں نہ ہو، چشمِ بتاں، محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ م یعنی، اُس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی م وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گل دیکھ، روئے یار یاد آیا، اسدؔ م جوششِ فصلِ بہاری، اشتیاق انگیز ہے

● ١٨١٦ء

نظر پرستی و بیکاریِ خود آرائی — رقیبِ آئینہ ہے، حیرتِ تماشائی
ز خود گزشتنِ دل، کاروانِ حیرت ہے — نگہ، غبارِ ادب گاہِ جلوہ فرمائی
نہیں ہے، حوصلہ، پامردِ کثرتِ تکلیف — جنونِ ساختہ، حرزِ فسونِ دانائی
بچشمِ دررشتہ، مژگاں ہے، جوہرِ رگِ خواب — نہ پوچھ تازگیِ وحشتِ شکیبائی
خرابِ نالۂ بلبل، شہیدِ خندۂ گل — ہنوز دعویِ تمکین و بیمِ رسوائی
شکستِ سازِ خیال، آں سوئے گرلوۂ غم — ہنوز نالہ پراَفشانِ ذوقِ رعنائی

ہزار قافلۂ آرزو، بیاباں مرگ
ہنوز محملِ حسرت بدوشِ خود رائی

وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا
اسد ہنوز، گمانِ غرورِ دانائی!

● ۱۸۱۶ء

گدائے طاقتِ تقریر ہے، زباں، تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے
چراغِ صبح، و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

بہارِ حیرتِ نظّارہ، سخت جانی ہے
حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں، تجھ سے

پری بہ شیشہ، و عکسِ رخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشّاطہ، خوں فشاں تجھ سے

طراوتِ سحر ایجادیٔ اثر یک سو
بہارِ نالہ و رنگینیٔ فغاں تجھ سے

چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس
امید، محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے

بہانہ جویٔ رحمت، کمیں گرِ تقریب
وفائے حوصلہ، و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسد طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے!
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

● ۱۸۱۶ء

نسکلِ طاؤس، گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں وہ گلدام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

پرِ طاؤس، تماشا نظر آیا ہے مجھے
ایک دل تھا کہ بصد رنگ دکھایا ہے مجھے

عکسِ خط، تا سخنِ ناصحِ دانا سرسبز
آئنہ، بیضۂ طوطی نظر آیا ہے مجھے

سنبلستانِ جنوں ہوں، ستمِ نسبتِ زلف
مو کشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے

گردباد، آئینۂ محشرِ خاکِ مجنوں
یک بیاباں دلِ بیتاب اٹھایا ہے مجھے

حیرتِ کاغذِ آتش زدہ ہے، جلوۂ عمر
تہِ خاکسترِ صد آئنہ پایا ہے مجھے

لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

دردِ اظہارِ تپش کسوتِ گل معلوم!
ہوں میں وہ چاک کہ کانٹوں سے سِلایا ہے مجھے

بے دماغِ تپش، و عرضِ دو عالم فریاد — ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے
جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے؟
جوششِ فریاد سے لونگا دیتِ خواب، اسد — شوخیِ نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

۱۸۱۶ء

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے — چاہوں گر سیرِ چمن، آنکھ دکھاتا ہے مجھے
م باغ، پاکر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے
ماہِ نو، ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے
م جوہرِ تیغ بسرِ چشمۂ دیگر معلوم! — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے
م مدّعا، محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
م نالہ، سرمایۂ یک عالم و عالم، کفِ خاک — آسماں، بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
م زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے — دیکھوں، اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے
شورِ تمثال ہے کس رشکِ حسن کا، یارب؟ — آئنہ، بیضۂ بلبل نظر آتا ہے مجھے
عبرتِ آئینۂ انجامِ جنوں ہوں جوں شمع — کس قدر داغِ جگر شعلہ اٹھاتا ہے مجھے
میں ہوں اور حیرتِ جاوید، مگر ذوقِ خیال — بفسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے
حیرتِ فکرِ سخن، سازِ سلامت ہے، اسد — دل پسِ زانوئے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے

۱۸۱۶ء

قتلِ عشّاق نہ غفلت کشِ تدبیر آوے — یارب، آئینہ بہ طاقِ خمِ شمشیر آوے
بالِ طاؤس ہے رعنائیِ ضعفِ پرواز — کون ہے داغ کہ شعلے کا عناں گیر آوے
عرضِ حیرانیِ بیمارِ محبت معلوم! — عیسیٰ، آخر بکفِ آئینۂ تصویر آوے
ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو، جوں شمع — پائے خوابیدہ، بہ دلجوئیِ شبگیر آوے
اُس بیاباں میں گرفتارِ جنوں ہوں کہ جہاں — موجۂ ریگ سے دل، پائے بہ زنجیر آوے

وہ گرفتارِ خرابی ہوں کہ فوّارہ نمط
سیل، صیادِ کمیں خانۂ تعمیر آوے

سرِ معنی بگریبانِ شقِ خامہ، اسدؔ
چاکِ دل، شانہ کشِ طرۂ تحریر آوے

۱۸۱۶ء

تشنۂ خونِ تماشا جو وہ پانی مانگے
آئنہ، رخصتِ اندازِ روانی مانگے

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس، پئے خامۂ مانی مانگے

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ، افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تبِ عشق تمنّا ہے کہ پھر، صورتِ شمع
شعلہ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

رنگ سے گل نے دمِ عرضِ پریشانیِ بزم
برگِ گل، ریزۂ مینا کی نشانی مانگے

زلف تحریرِ پریشانِ تقاضا ہے، مگر
شانہ ساں، مو بہ زباں خامۂ مانی مانگے

آمدِ خط ہے، نہ کر خندۂ شیریں کہ، مبادا
چشمِ مور، آئنۂ دل نگرانی مانگے

ہوں گرفتارِ کمیں گاہِ تغافل کہ جہاں
خوابِ صیاد سے، پرواز، گرانی مانگے

چشمِ پرواز و نفس خفتہ، مگر ضعفِ امید
شہپرِ کاہ، پئے مژدہ رسانی مانگے

وحشتِ شورِ تماشا ہے کہ جوں نکہتِ گل
نمکِ زخمِ جگر بال فشانی مانگے

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ، آئینۂ پردازِ معانی مانگے

۱۸۱۶ء

ہر قدم، دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ، رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیخودی، بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو!
پُر ہے سائے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے — م — ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بےکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے! — م — سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے — م — آئنہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ — م — ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

خوابِ جمعیتِ مخمل ہے پریشاں مجھ سے — رگِ بستر کو ملی شوخیِ مژگاں مجھ سے
کنجِ تاریک و کمیں گیریِ اختر شمری — عینکِ چشم بنا روزنِ زنداں مجھ سے
اے تسلّی، ہوسِ وعدہ فریب افسوں ہے — ورنہ کیا ہو نہ سکے نالہ بہ ساماں مجھ سے؟
بستنِ عہدِ محبت ہمہ نادانی تھا — چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے
آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما مجھ سے — چشمک آرائیِ صد شہرِ چراغاں مجھ سے
اے اسدؔ، دسترسِ وصلِ تمنا معلوم — کاش! ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

● ۱۸۱۶ء

فرصت، آئینۂ صد رنگ خود آرائی ہے — روز و شب، یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے
وحشتِ زخمِ وفا دیکھ کہ سرتا سرِ دل — بخیہ، جوں جوہرِ تیغ، آفتِ گیرائی ہے
شمع آسا، پئے سرِ دعویٰ؟ وکو پائے ثبات؟ — گلِ صد شعلہ، بہ یک جیبِ شکیبائی ہے
نالہ خونیں ورق، و دل گلِ مضمونِ شفق — چمن آرائے نفس، وحشتِ تنہائی ہے
بوئے گل فتنۂ بیدار، و چمن جامۂ خواب — وصلِ ہر رنگ جنوں کسوتِ رسوائی ہے
شرم، طوفانِ خزاں رنگِ طرب گاہِ بہار — ماہتابی بکفِ چشمِ تماشائی ہے
باغِ خاموشیِ دل سے سخنِ عشق، اسدؔ — نفسِ سوختہ رمزِ چمن ایمائی ہے

● ۱۸۱۶ء

کارگاہِ ہستی میں لالہ، داغ ساماں ہے م
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتنہا، برگِ عافیت معلوم! م.
باوجودِ دل جمعی، خوابِ گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اُٹھایا جائے؟ م
داغ، پشتِ دستِ عجز، شعلہ، خس بدنداں ہے

جوہرِ زُلف کی تقریر، پیچتابِ خاموشی ا
بندمیں اسدؔ نالاں، نالہ درصفاہاں ہے

حیرتِ تپیدنہا، خوں بہائے دیدنہا
رنگِ گل کے پردے میں آئنہ پرافشاں ہے

عشق کے تغافل سے، ہرزہ گرد ہے عالم
روئے شش جہت آفاق، پشتِ چشمِ زنداں ہے

وحشت انجمن ہے گل، دیکھ لالے کا عالم
مثلِ دودِ مجمر کے، داغ بال افشاں ہے

اے کرم نہ ہو غافل، ورنہ ہے اسدؔ بیدل
بے گہر صدف گویا، پشتِ چشمِ نیساں ہے

● ۱۸۱۶ء

گریہ سرشاریِ شوق بہ بیاباں زدہ ہے
قطرۂ خونِ جگر، چشمکِ طوفاں زدہ ہے

گریہ بے لذتِ کاوش نہ کرے جراتِ شوق
قطرۂ اشک، دل بر صفِ مژگاں زدہ ہے

بے تماشا نہیں جمعیتِ چشمِ بسمل
مژہ فالِ دو جہاں خوابِ پریشاں زدہ ہے

فرصتِ آئینہ، و پروازِ عدم تا ہستی
یک شرر بال دل، و دیدہ چراغاں زدہ ہے

نقشِ رنگینیِ سعیِ قلمِ مانی ہے
بحر دامنِ صد رنگ گلستاں زدہ ہے

درسِ نیرنگ ہے کس موجِ نگہ کا، یارب؟
غنچہ، صد آئنہ زانوئے گلستاں زدہ ہے

سازِ وحشت رقمیہا، کہ باظہار اسدؔ
دشت و رنگ، آئینہ صفوِ افشاں زدہ ہے

● ۱۸۱۶ء

خوابِ غفلت بہ کمیں گاہِ نظر پنہاں ہے
شام، سائے میں بتاراجِ سحر پنہاں ہے

دو جہاں، گردشِ یک سبحۂ اسرارِ نیاز
نقدِ صد دل بگریبانِ سحر پنہاں ہے

خلوتِ دل میں نہ کر دخل، بجز سجدۂ شوق
آستاں میں، صفتِ آئینہ، در پنہاں ہے

فکرِ پروازِ جنوں ہے، سببِ ضبط نہ پوچھ
اشک، جوں بیضہ، مژہ سے تہِ پر پنہاں ہے

ہوش، اے ہرزہ درا، تہمتِ بیدردی چند؟
نالہ، در گردِ تمنائے اثر پنہاں ہے

وہمِ غفلت، مگر، احرامِ فسردن باندھے
ورنہ، ہر سنگ کے باطن میں شرر پنہاں ہے

وحشتِ دل ہے، اسدؔ، عالمِ نیرنگِ نشاط
خندۂ گل، بلبِ زخمِ جگر پنہاں ہے

۱۸۱۶ء

دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچیے
اے مدّعی، خجالتِ بیجا نہ کھینچیے

گل، سر بسر، اشارۂ جیبِ دریدہ ہے
نازِ بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

حیرت حجابِ جلوہ، و وحشت غبارِ چشم
پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچیے

واماندگی بہانہ، و دلبستگی فریب
دردِ طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے

کرتے ہوئے تصورِ یار آئے ہے حیا
کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچیے

گر صفحے کو نہ دیکھیے پروازِ سادگی
جز خطِ عجز، نقشِ تمنا نہ کھینچیے

دیدارِ دوستانِ لباسی ہے ناگوار
صورت بہ کارخانۂ دیبا نہ کھینچیے

ہے بے خمار نشۂ خونِ جگر، اسدؔ
دستِ ہوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچیے

۱۸۱۶ء

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع، دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

بہزاد، نقشِ یک دلِ صد چاک عرض کر
گر زلفِ یار کھینچ نہ سکے، شانہ کھینچیے

راحت کمینِ شوخیِ تقریبِ نالہ ہے
پائے نظر بہ دامنِ افسانہ کھینچیے

زلفِ پری، بہ سلسلۂ آرزو رسا
یک عمر، دامنِ دلِ دیوانہ کھینچیے

یعنی دماغِ غفلتِ ساقی رسیدہ تر
خمیازۂ خمار سے پیمانہ کھینچیے

پروازِ آشیانۂ عنقائے ناز ہے
بالِ پری بہ وحشتِ بیجا نہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر ‏ دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

ہے ذوقِ گریہ، عزمِ سفر کیجیے، اسدؔ ‏ رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

● ۱۸۱۶ء

آئینہ کیوں نہ دوں، کہ تماشا کہیں جسے؟ م ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہے انتظار سے شرر آبادِ رستخیز ‏ مژگانِ کوہکن، رگِ خارا کہیں جسے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو، عندلیب ‏ زخمِ فراق، خندۂ بیجا کہیں جسے

یا رب، ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو ‏ یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں م گلدستۂ نگاہ، سُوَیدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا؟ م افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے، ڈالیے م وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں، حسرتِ دیدار سے نہاں م شوقِ عِناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو م صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ، بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے م ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

● ۱۸۱۶ء

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے م نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے، حیرت کو، اے خدا! م آئینہ، فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

دل مدّعی، و دیدہ بنا مدّعیٰ علیہ م نظّارے کا مقدّمہ پھر روبکار ہے

ہے ذرّہ ذرّہ، تنگیِ جا سے، غبارِ شوق م گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے م وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ، سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر م ہر ذرّے کے نقاب میں، دل بیقرار ہے

اے عندلیب، یک کفِ خس بہرِ آشیاں م طوفانِ آمدِ آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی م اے بے دماغ، آئنہ تمثال دار ہے
چھڑکے ہے شبنم، آئینۂ برگِ گل پہ، آب م اے عندلیب، وقتِ وداعِ بہار ہے
غفلت کفیلِ عمر، و اسدؔ ضامنِ نشاط م اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے

۱۸۱۶ء

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے داماںِ صد کفن، تہِ سنگِ مزار ہے
عبرت طلب ہے، حلِّ معمّائے آگہی شبنم، گدازِ آئینۂ اعتبار ہے
خجلت کشِ وفا کو شکایت نہ چاہیے اے مدّعی، طلسمِ عرق بے غبار ہے
کیفیتِ ہجومِ تمنا رسا، اسدؔ خمیازہ، ساغرِ مے رنجِ خمار ہے

۱۸۱۶ء

مستی، بذوقِ غفلتِ ساقی، ہلاک ہے م موجِ شراب، یک مژۂ خوابناک ہے
کلفت، طلسمِ جلوۂ کیفیتِ دگر زنگار خوردہ آئنہ، یک برگِ تاک ہے
ہے عرضِ جوہرِ خط و خالِ ہزار عکس لیکن ہنوز دامنِ آئینہ پاک ہے
ہوں خلوتِ فسردگیِ انتظار میں وہ بیدماغ جس کو ہوس بھی تپاک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو م جیبِ خیال بھی، ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدؔ م صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

حسنِ بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے م آئینہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا، اے آگہی، رنگِ تماشا باختن؟ م چشمِ واگردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے
عجزِ دیدنہا بناز، و نازِ رفتنہا بچشم جادۂ صحرائے آگاہی، شعاعِ جلوہ ہے

اختلافِ رنگ و بو، طرحِ بہارِ بیخودی
صلحِ گل، گردِ ادب گاہِ نزاعِ جلوہ ہے

حسنِ خوباں بسکہ بے قدرِ تماشا ہے، اسدؔ
آئینہ یک دستِ ردِّ امتناعِ جلوہ ہے

● ۱۸۱۶ء

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے
م دعویِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے
ہر شکستِ قیمتِ دل میں صدائے خندہ ہے

نقشِ عبرت در نظر، یا نقدِ عشرت در بساط
دو جہاں وسعت، بقدرِ یک فضائے خندہ ہے

ہے عدم میں، غنچہ، محوِ عبرتِ انجامِ گل
م یک جہاں زانو تامل، در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
م ورنہ دنداں در دل افشردن، بنائے خندہ ہے

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
م دل، محیطِ گریہ و لب، آشنائے خندہ ہے

جائے استہزا ہے، عشرت کوشیِ ہستی، اسدؔ
صبح و شبنم، فرصتِ نشو و نمائے خندہ ہے

● ۱۸۱۶ء

شوخیِ مضرابِ جولاں، آبیارِ نغمہ ہے
برگ ریزِ ناخنِ مطرب، بہارِ نغمہ ہے

کس سے، اے غفلت، تجھے تعبیرِ آگاہی ملے؟
گوشہا سیمابی، و دل بے قرارِ نغمہ ہے

سازِ عیشِ بے دلی ہے، خانہ ویرانی، کہ یاں
سیل ہا یاں کوکِ صدائے آبشارِ نغمہ ہے

سنبلی نواں ہے، بذوقِ تارِ گیسوئے دراز
تارِ زنجیرِ مجنوں، رشتہ دارِ نغمہ ہے

شوخیِ فریاد سے ہے پردۂ زنبور، گل
کسوتِ ایجادِ بلبل، خار خارِ نغمہ ہے

نشہ ہا، شادابِ رنگ، و سازہا مستِ طرب
م شیشۂ مے، سروِ سبزِ جویبارِ نغمہ ہے

ہم نشیں، مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
م واں تو، میرے نالے کو بھی، اعتبارِ نغمہ ہے

غفلت استعدادِ ذوق، و مدعا غافل اسدؔ
پنبۂ گوشِ حریفاں، پود و تارِ نغمہ ہے

● ۱۸۱۶ء

رحم کر، ظالم! کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے! م نبضِ بیمارِ وفا، دودِ چراغِ کشتہ ہے
نشۂ مے، بے چمن، دودِ چراغِ کشتہ ہے جام، داغِ شعلہ اندودِ چراغِ کشتہ ہے
داغِ ربطِ ہم ہیں اہلِ باغ، گر گل ہو شہید لالہ، چشمِ حسرت آلودِ چراغِ کشتہ ہے
شور ہے کس بزم کی عرضِ جراحت خانہ کا؟ صبح، یک زخمِ نمک سودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں م ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کشتہ ہے
نامرادِ جلوہ، ہر عالم میں حسرت گل کرے لالہ، داغِ شعلہ فرسودِ چراغِ کشتہ ہے
ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بے خودی خوابِ نازِ گلرخاں، دودِ چراغِ کشتہ ہے
ہے، دلِ افسردہ، داغِ شوخیِ مطلب، اسدؔ شعلہ، آخر فالِ مقصودِ چراغِ کشتہ ہے

● ۱۸۱۶ء

تپش سے میری، وقفِ کشمکش، ہر تارِ بستر ہے م مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے
بذوقِ شوخیِ اعضا، تکلّف بارِ بستر ہے معافِ پیچ تابِ کشمکش، ہر تارِ بستر ہے
معمّائے تکلّف، سر بمہرِ چشم پوشیدن گدازِ شمعِ محفل، پیچشِ طومارِ بستر ہے
خرد فرشِ رہ، و دل ناتوان، و آرزو مضطر بپائے خفتہ، سیرِ وادیِ پُرخارِ بستر ہے
سرِ اشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے م دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر ہے
خوشا! اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو م فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی م شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی م ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالبؔ؟ م کہ بیتابی سے، ہر یک تارِ بستر، خارِ بستر ہے

● ۱۸۱۶ء

خطر ہے، رشتۂ الفت، رگِ گردن نہ ہو جاوے م غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جاوے
غضب شرم آفریں ہے رنگ ریزی ہائے خود بینی سپیدی آئینے کی پنبۂ روزن نہ ہو جاوے

بپاسِ شوخیِ مژگاں، سرِ ہر خار سوزن ہے
تبسّم برگِ گُل کو، بخیۂ دامن نہ ہوجاوے

جراحت دوزیِ عاشق ہے، جائے رحم ترساہوں
کہ رشتہ تارِ اشکِ دیدۂ سوزن نہ ہوجاوے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشوونما، غالب
اگر گُل، سرو کے قامت پہ، پیراہن نہ ہوجاوے

● ۱۸۱۶ء

نوائے خفتۂ الفت، اگر، بیتاب ہوجاوے
پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہوجاوے

اگر وحشت عرق افشانِ بے پرواخرامی ہو
بیاضِ دیدۂ آہو کفِ سیلاب ہوجاوے

زبس طوفانِ آب و گل ہے، غافل کیا تعجب ہے!
کہ ہر یک گرد بادِ گلستاں گرداب ہوجاوے

اثر میں یاں تک، اے دستِ دعا، دخلِ تفرّق کر
کہ سجدہ قبضۂ تیغِ خمِ محراب ہوجاوے

برنگِ گُل، اگر شیرازہ بندِ بے خودی رہیے
ہزار آشفتگی، مجموعۂ یک خواب ہوجاوے

نمک بر داغِ خشک آلودۂ وحشت تماشا ہے
سوادِ دیدۂ آہو شبِ مہتاب ہوجاوے

اسد، باوصفِ مشقِ بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے، اگر غبارِ خاطرِ احباب ہوجاوے

● ۱۸۱۶ء

دلِ بیمار از خود رفتہ، تصویرِ نہالی ہے
کہ مژگاں، ریشہ دارِ نیستانِ شیر قالی ہے

سرورِ نشۂ گردش، اگر کیفیت افزا ہو
نہاں ہر گرد بادِ دشت میں جامِ سفالی ہے

عروجِ نشہ ہے سرتاقدم، قدِ چمن رویاں
بجائے خود، وگرنہ، سرو بھی مینائے خالی ہے

ہُوا آئینہ، جامِ بادہ عکسِ روئے گلگوں سے
نشانِ خالِ رخ، داغِ شرابِ پرتگالی ہے

بپائے خامہ موا طے رہِ وصفِ کمر کیجے
کہ تارِ جادۂ سرمنزلِ نازک خیالی ہے

اسد، اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

۱۸۱۶ء

شبنم، بگلِ لالہ، نہ خالی زِ ادا ہے م داغِ دلِ بے درد، نظر گاہِ حیا ہے
دل، خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار م آئینہ، بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی م جی، کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق م آئینہ، بہ اندازِ گُل، آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر، و بلبل قفسِ رنگ م اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو م معشوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت م دستِ تہِ سنگ آمدہ، پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ م تیغِ ستم، آئینۂ تصویر نما ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہانتاب! ادھر بھی م سائے کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
سر رشتۂ بیتابیِ دل، در گرہِ عجز م پرواز بہ خوں خفتہ و فریاد رسا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد م یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالبؔ م کوئی نہیں تیرا، تو، مری جان خدا ہے

زلفِ سیہ، افعیِ نظرِ بد قلمی ہے م ہر چند خطِ سبز و زمرّد رقمی ہے
ہے مشقِ وفا، جانتے ہیں، لغزشِ پا تک م اے شمع، تجھے دعویِ ثابت قدمی ہے
ہے عرضِ شکست، آئینۂ جراتِ عاشق م جز آہ کہ سر لشکرِ وحشت علمی ہے
واماندۂ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں م اے حسرتِ بسیار، تمنا کی کمی ہے
وہ پردہ نشیں، اور اسدؔ آئینۂ اظہار م شہرت چمنِ فتنہ و عنقا اری ہے

اس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے م تسلیم فروشی، روشِ کبکِ دری ہے
شرمندۂ الفت ہوں مداوا طلبی سے م ہر قطرۂ شربت مجھے اشکِ جگری ہے
سرمایۂ وحشت ہے، دلا، سایۂ گلزار م ہر سبزۂ نوخاستہ یاں بالِ پری ہے

روشن ہوئی یہ بات دمِ نزع کہ آخر — فانوس، کفن بہرِ چراغِ سحری ہے

ہم آئے ہیں، غالبؔ، رہِ اقلیمِ عدم سے
یہ تیرگیِ حال لباسِ سفری ہے

١٨١٦ء

تا چند، نفَس، غفلتِ ہستی سے بر آوے — قاصد تپشِ نالہ ہے، یا رب، خبر آوے!
ہے طاقِ فراموشیِ سودائے دو عالم — وہ سنگ کہ گلدستۂ جوشِ شرر آوے
درد، آئنۂ کیفیتِ صد رنگ ہے، یا رب — خمیازۂ طرب، ساغرِ زخمِ جگر آوے!
جمعیتِ آوارگیِ دید نہ پوچھو — دل تا مژہ، آغوشِ وداعِ نظر آوے
اے ہرزہ دوی، منتِ تمکینِ جنوں کھینچ — تا آبلہ محمل کشِ موجِ گہر آوے
زاہد کہ جنوں سبحۂ تحقیق ہے، یا رب — زنجیریِ صد حلقۂ بیرونِ در آوے
وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو — ہر ذرہ بکیفیتِ ساغر نظر آوے
تمثالِ بتاں گر نہ رکھے پنبۂ مرہم — آئینہ بہ عریانیِ زخمِ جگر آوے

ہر غنچہ، اسدؔ، بارگہِ شوکتِ گل ہے
دل فرشِ رہِ ناز ہے، بیدلؔ اگر آوے

١٨١٦ء

نگہ اُس چشم کی، افزوں کرے ہے ناتوانائی — پرِ بالش ہے وقتِ دید، مژگانِ تماشائی
شکستِ قیمتِ دل، آں سوئے عذرِ شناسائی — طلسمِ نا امیدی ہے، نجاتِ گاہِ پیدائی
تحیّر ہے گریباں گیرِ ذوقِ جلوہ پیرائی — ملی ہے جوہرِ آئینہ کو، جوں بخیہ گیرائی
پرِ طاؤس ہے نیرنگِ داغِ حیرت انشائی — دو عالم دیدۂ بسمل چراغاں جلوہ پیمائی
شرارِ سنگ سے پا در حنا گلگونِ شیریں ہے — ہنوز، اے تیشۂ فرہاد، عرضِ آتشیں پائی
غرورِ دستِ ردِّ شانہ توڑا فرقِ ہدہد پر — سلیمانی، ہے ننگِ بے دماغانِ خود آرائی

جنوں افسردہ و جاں ناتواں، اے جلوۂ شوخی کر
گئی یک عمر خود داری با ستقبالِ رعنائی

نگاہِ عبرت افسوں، گاہ برق و گاہ مشعل ہے
ہوا ہر خلوت و بخلوت سے حاصل، ذوقِ تنہائی

خدایا، خوں ہو رنگِ امتیاز اور نالہ موزوں ہو
جنوں کو سخت بیتابی ہے تکلیفِ شکیبائی

جنونِ بیکسی ساغر کشِ داغِ پلنگ آیا
شررِ کیفیتِ مے، سنگ محوِ نازِ مینائی

خراباتِ جنوں میں ہے، اسد، وقتِ قدح نوشی
بہ عشقِ ساقیِ کوثر، بہارِ بادہ پیمائی

۱۸۱۶ء

غم و عشرت، قدمبوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دعائے مدعا گم کردگاں، لبریزِ آمیں ہے

تماشا ہے کہ ناموسِ وفا رسوائے آئیں ہے
نفس تیری گلی میں خوں ہو، اور بازار رنگیں ہے

ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے اسیرِ گلستاں کر
شرارِ آہ سے، موجِ صبا، دامانِ گلچیں ہے

پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے
شبِ ماتم، اتر دامانِ دودِ شمعِ بالیں ہے

زبس جز حسن، منت ناگوارا ہے طبیعت پر
کشادِ عقد، محوِ ناخنِ دستِ نگاریں ہے

نہیں ہے سرنوشتِ عشق، غیر از بیدماغی ہا
جبیں پر میری، مدِ خامۂ قدرت، خط چیں ہے

بہارِ باغ، پامالِ خرامِ جلوہ فرمایاں
حنا سے دست، و خونِ کشتگاں سے تیغ رنگیں ہے

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
م
قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

بیابانِ فنا ہے بعد صحرائے طلب، غالب
پسینہ توسنِ ہمت کا، سیلِ خانۂ زیں ہے

۱۸۱۶ء

محوِ آرامیدگی، سامانِ بیتابی کرے
چشم میں توڑے نمکداں، تا شکر خوابی کرے

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں، گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

نغمہ ہا، وابستۂ یک عقدۂ تارِ نفس
ناخنِ تیغِ بتاں، شاید کہ مضرابی کرے

سبحدم وہ جلوہ ریزِ بے نقابی ہو اگر
رنگِ رخسارِ گلِ خورشید، مہتابی کرے

زخمہائے کہنہ، دل رکھتے ہیں جوں مردگی
اے خوشا! گر آبِ تیغِ ناز تیزابی کرے

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب، تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

● ۱۸۱۶ء

اے خوشا! وقتے کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل، پنبۂ مینا کرے

گرتبِ آسودۂ مژگاں تصرف وا کرے
رشتۂ پا، شوخیِ بالِ نفس پیدا کرے

گر دکھاؤں صفحۂ بے نقشِ رنگِ رفتہ کو
دستِ رد، سطرِ تبسم یک قلم انشا کرے

جو عزادارِ شہیدانِ نفس در دیدہ ہو
نوحۂ ماتم بآوازِ پرِ عنقا کرے

حلقۂ گردابِ جوہر کو بنا ڈالے تنور
عکس، اگر طوفانیِ آئینۂ دریا کرے

یک درِ بر روئے رحمت بستہ دوریِ شش جہت
ناامیدی ہے، خیالِ خانہ ویراں کیا کرے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا؟
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی، اسد
ہوں سراپا یک خمِ تسلیم، جو مولا کرے

● ۱۸۱۶ء

چاک کی خواہش، اگر وحشت، بہ عریانی کرے
م صبح کے مانند، زخمِ دل، گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
م دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب، کب تلک
م آبگینہ، کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے؟

میکدہ، گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
م موئے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے، زلف کو الفت نے، عہد
م یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقتِ قہقہہ
کرمکِ شب تاب آسا، مہ پر افشانی کرے

وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے، اسد
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

● ۱۸۱۶ء

بہ نقصِ ظاہری، رنگِ کمالِ طبع، پنہاں ہے
کہ بہرِ مدعائے دل، زبانِ لال، زنداں ہے

خموشی، بخانہ زادِ چشمِ بے پروا نگاہاں ہے
غبارِ سرمہ، یاں گردِ سوادِ نرگستاں ہے

صفائے اشک میں داغِ جگر جلوہ دکھاتے ہیں — پرِ طاؤس، گویا، برقِ ابرِ چشمِ گریاں ہے
بہ بوئے زلفِ مشکیں یہ، دماغ، آشفتۂ رم ہیں — کہ شاخِ آہواں، دودِ چراغِ اسدا پریشاں ہے
تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں ! م نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے
اسدؔ، یہ فرطِ غم نے کی تلف کیفیتِ شادی م کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

۶۱۸۱۶

تمام اجزائے عالم صیدِ دامِ چشمِ گریاں ہے — طلسمِ شش جہت، یک حلقۂ گردابِ طوفاں ہے
نہیں ہے مردنِ صاحبدلاں، جز کسبِ جمعیت — سویدا میں نفس، مانندِ خطِ نقطے میں، پنہاں ہے
غبارِ دشتِ وحشت، سرمہ سازِ انتظار آیا — کہ چشمِ آبلہ میں، طولِ میلِ راہ، مژگاں ہے
زبس دوشِ رمِ آہو پہ ہے محملِ تمنا کا — جنونِ قیس سے بھی شوخیِ لیلیٰ نمایاں ہے
نقابِ یار ہے، غفلت نگاہی اہلِ بینش کی — مژہ پوشیدنی ہا، پردۂ تصویرِ عریاں ہے
اسدؔ، بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ — اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

۶۱۸۱۶

ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے م خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے م کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستگرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو م چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے
کجا ہے ! کو عرق ؟ سعیِ عروجِ نشہ رنگیں تر — خطِ رخسارِ ساقی، تا خطِ ساغر، چراغاں ہے
رہا بے قدر دل، در پردۂ جوشِ ظہور آخر — گل و نرگس بہم، آئینہ و اقلیمِ کوراں ہے
تکلف سازِ رسوائی ہے، غافل، شرمِ رعنائی — دلِ خوں گشتہ، در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے
تماشا، سرخوشِ غفلت ہے باوصفِ حضورِ دل — ہنوز آئینہ، خلوت گاہِ نازِ ربطِ مژگاں ہے
تکلف برطرف، ذوقِ زلیخا جمع کر، ورنہ — پریشاں خوابِ آغوشِ وداعِ یوسفستاں ہے
اسدؔ، جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر — دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

● ۱۸۱۶ء

تغافل مشربی سے، ناتمامی بسکہ پیدا ہے
نگاہِ ناز، چشمِ یار میں زنّارِ مینا ہے

تصرف وحشیوں میں ہے تصور ہائے مجنوں کا
سوادِ چشمِ آہو، عکسِ خالِ روئے لیلیٰ ہے

محبت، طرزِ پیوندِ نہالِ دوستی جانے
دویدن، ریشہ ساں، مفتِ رگِ خوابِ زلیخا ہے

کیا یکسر گدازِ دل نیازِ جوششِ حسرت
سویدا، نسخۂ تہ بندیِ داغِ تمنا ہے

بجوم ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیاد، مرغِ رشتہ برپا ہے

اسد، گر نام والائے علی تعویذِ بازو ہو
غریقِ بحرِ خوں، تمثال در آئینہ رہنا ہے

● ۱۸۱۶ء

اثر سوزِ محبت کا، قیامت بے محابا ہے
کہ رگ سے سنگ میں تخمِ شرر کا ریشہ پیدا ہے

نہاں ہے گوہرِ مقصود جیبِ خود شناسی میں
کہ یاں غواص ہے تمثال، اور آئینہ دریا ہے

عزیزو، ذکرِ وصلِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ
کہ یاں افسونِ خواب، افسانۂ خوابِ زلیخا ہے

تصور، بہرِ تسکینِ تپیدن ہائے طفلِ دل
بباغِ رنگ ہائے رفتہ، گلچینِ تماشا ہے

بہ سعیِ غیر ہے، قطعِ لباسِ خانہ ویرانی
کنارِ جادۂ رہ، رشتۂ دامانِ صحرا ہے

مجھے شب ہائے تاریکِ فراقِ شعلہ رویاں میں
چراغِ خانۂ دل، سوزشِ داغِ تمنا ہے

ترے نوکر ترے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستمگر، ناخدا ترس، آشنا کش، ماجرا کیا ہے؟

● ۱۸۱۶ء

یہ بزمِ مے پرستی، حسرتِ تکلیفِ بے جا ہے
کہ جامِ بادہ، کفِ بر لب بتقریبِ تقاضا ہے

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
م جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
م وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم
م اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟

نہ لائی شوخیِ اندیشہ، تابِ رنجِ نومیدی
م کفِ افسوس ملنا، عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

نشاطِ دیدۂ بینا ہے، کو خواب؟ کو چہ بیداری؟
نگہ، معمارِ حسرتہا۔ چہ آبادی؟ چہ ویرانی؟
نہ سووے آبلوں میں، گر، سرشکِ دیدۂ نم سے
بہ سختی ہاے قیدِ زندگی، معلوم آزادی
اسدؔ، پاسِ تمنا سے نہ رکھ امیدِ آزادی

بہم آوردہ مژگاں، روے بروے تماشا ہے
کہ مژگاں جس طرف وا ہو، بکفِ دامانِ صحرا ہے
بجولاں گاہِ نومیدی، نگاہِ عاجزاں، پا ہے
شرر بھی صیدِ دامِ رشتۂ رگ ہاے خارا ہے
گدازِ ہر تمنا آبیارِ صد تمنا ہے

● ۱۸۱۶ء

بہر پروردن سراسر لطفِ گستر، سایہ، ہے
فصلِ گل میں، دیدۂ خونیں نگاہانِ جنوں
شورشِ باطن سے یاں تک مجھکو غفلت ہے کہ آہ!
کیوں نہ تیغِ یار کو مشاطۂ الفت کہوں؟
اے اسدؔ، آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری

پنجۂ مژگاں، بہ طفلِ اشک دستِ دایہ ہے
دولتِ نظارۂ گل سے شفق سرمایہ ہے
شیونِ دل، یک سرودِ خانۂ ہمسایہ ہے
زخمِ مثلِ گل، سراپا کا مرے پیرایہ ہے
خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے

● ۱۸۱۶ء

وہ نہا کر آبِ گل سے سایۂ گل کے تلے
کثرتِ جوشِ سویدا سے نہیں تل کی جگہ
بسکہ خوباں باغ کو دیتے ہیں وقتِ مے شکست
ہے پرافشانِ تپیدن ہا بہ تکلیفِ ہوس
پے بمقصد بُردنی ہے خضرِ مے سے، اے اسدؔ

بال کس گرمی سے سکھلاتا تھا سنبل کے تلے
خال کب مشاطہ دے سکتی ہے کاکل کے تلے
بال اُگ جاتا ہے شیشے کا رگِ گل کے تلے
ورنہ صد گلزار ہے یک بالِ بلبل کے تلے
جادۂ منزل ہے خطِ ساغرِ گل کے تلے

● ۱۸۱۶ء

جوہر آئینہ ساں، مژگاں بدل آسودہ ہے
قطرہ جو آنکھوں سے ٹپکا سو نگاہ آلودہ ہے

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں؟
پرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

اے ہوس، عرضِ بساطِ نازِ مشتاقی نہ مانگ
جوں پرِ طاؤس، یکسر داغِ خشک اندودہ ہے

ہے ریا کا رتبہ بالاتر تصور کردنی
تیرگی سے داغ کی، مہ، اسمِ جسم اندودہ ہے

کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش؟
عافیت، سرمایۂ بال و پرِ نکشودہ ہے

پنبۂ مینائے مے رکھ لو تم اپنے کان میں
نے پرستاں، ناصحِ بے صرفہ گو بیہودہ ہے

جس طرف سے آئے ہیں، آخر ادھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے

ہے سوادِ خط، پریشاں موئی اہلِ عزا
خامہ میرا شمعِ قبرِ کشتگاں کا دودہ ہے

کثرتِ انشائے مضمونِ تحیر سے، اسدؔ
ہر سرِ انگشت، نوکِ خامۂ فرسودہ ہے

● ۱۸۱۶ء

بہارِ تعزیتِ آبادِ عشق، ماتم، ہے
کہ تیغِ یار، ہلالِ مہِ محرّم ہے

بہ رہنِ ضبط ہے، آئینہ بندیِ گوہر
وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پرنم ہے

چمن میں کون ہے طرز آفرینِ شیوۂ عشق؟
کہ گل ہے بلبلِ رنگین و بیضہ شبنم ہے

اگر نہ ہووے رگِ خواب حرفِ شیرازہ
تمام دفترِ ربطِ مزاج درہم ہے

اسدؔ، بہ نازکیِ طبعِ آرزو انصاف!
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

● ۱۸۱۶ء

عذارِ یار، نظر بندِ چشمِ گریاں ہے
عجب کہ پرتوِ خور، شمعِ شبنمستاں ہے

ہجومِ ضبطِ فغاں سے مری زبانِ خموش
برنگِ لستہ، بہ زہراب دادہ پیکاں ہے

قبائے جلوہ فزا ہے، لباسِ عریانی
بطرزِ گل، رگِ جاں مجھکو تارِ داماں ہے

لبِ گزیدۂ معشوق ہے، دلِ افگار
کہ بخیہ جلوۂ آثارِ زخمِ دنداں ہے

کشودِ غنچۂ خاطر عجب نہ رکھ، غافل
صبا خرامیِ خوباں، بہارِ ساماں ہے

فغاں! کہ بہرِ شفائے حصولِ ناشدنی
دماغ، نازکشِ منتِ طبیباں ہے

طلسمِ منّتِ یک خلق سے رہائی دی — جہاں جہاں مرے قاتل کا مجھ پہ احساں ہے
جنوں نے مجھ کو بنایا ہے مدّعی میرا — ہمیشہ ہاتھ میں میرے مرا گریباں ہے

اسد کو زیست تھی مشکل، اگر نہ سن لیتا
کہ قتلِ عاشقِ دلدادہ تجھ کو آساں ہے

۱۸۱۶ء

شفق، بدعویِ عاشق گواہِ رنگیں ہے — کہ ماہ، دزدِ حنائے کفِ نگاریں ہے
کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے — م — کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
کرے ہے، بادہ ترے لب سے، کسبِ رنگِ فروغ — م — خطِ پیالہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے
بجا ہے، گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار — م — کہ گوشِ گل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
عیاں ہے پائے حنائی برنگِ پرتوِ خور — رکاب، روزنِ دیوارِ خانۂ زیں ہے
جبینِ صبحِ امیدِ فسانہ گویاں پر — درازیِ رگِ خوابِ بتاں خطِ چیں ہے
ہوا، نشانِ سوادِ دیارِ حسن، عیاں — کہ خط، غبارِ زمیں خیزِ زلفِ مشکیں ہے
اسد ہے نزع میں، چل، بیوفا، برائے خدا — م — مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے
نہ پوچھ کچھ سر و سامان و کاروبارِ اسد — جنوں معاملہ، بیدل، فقیرِ مسکیں ہے

روتا ہوں بسکہ در ہوسِ آرمیدگی — جوں گوہر، اشک کو ہے فرامش چکیدگی
برخاک اوفتادگیِ کشتگانِ عشق — ہے سجدۂ سپاس بمنزل رسیدگی
انساں نیازمندِ ازل ہے کہ جوں کماں — مطلب ہے ربط سے رگ و پے کی خمیدگی
ہے بسملِ ادائے چمن عارضاں، بہار — گلشن کو رنگِ گل سے ہے درخوں تپیدگی

دیکھا نہیں ہے ہم نے بعشقِ بتاں، اسد
غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی

۱۸۱۶ء

عاشق، نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے / فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل / حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق / اے بے تمیز، گنج کو ویرانہ چاہیے
ساقی، بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش / پیماں سے ہم گزر گئے، پیمانہ چاہیے
ہے وصل، ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں م / معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں م / شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے
جادو ہے یار کی روشِ گفتگو، اسدؔ / یاں جز فسوں نہیں، اگر افسانہ چاہیے

۱۸۱۶ء

یوں، بعدِ ضبطِ اشک، پھروں گرد یار کے / پانی پیے کسو پہ کوئی جیسے وار کے
بعد از وداعِ یار، بخوں در تپیدہ ہیں / نقشِ قدم ہیں ہم، کفِ پائے نگار کے
ظاہر ہے ہم سے، کلفتِ بختِ سیاہ روز / گویا کہ تختۂ مشق ہیں خطِ غبار کے
سیماب، پشتِ گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم م / حیراں کیے ہوئے ہیں، دلِ بے قرار کے
آغوشِ گل، کشودہ برائے وداع ہے م / اے عندلیب، چل کہ چلے دن بہار کے
حسرت سے دیکھ رہتے ہیں، ہم، آب و رنگِ گل / مانندِ شبنم، اشک ہیں مژگانِ خار کے
ہم، مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے، اسدؔ / لائق نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

۱۸۱۶ء

بہ فکرِ حیرتِ رم، آئنہ پرداز زانو ہے / کہ مشکِ نافہ تمثالِ سوادِ چشمِ آہو ہے
ترحم میں ستم کوشوں کے ہے سامانِ خونریزی / سرِ شکِ چشمِ یار، آبِ دمِ شمشیرِ ابرو ہے
کرے ہے دست فرسودِ ہوس، وہمِ توانائی / پرِ افشاندہ در کنجِ قفس، تعویذِ بازو ہے

ہوا چرخِ خمیدہ، ناتواں بارِ علائق سے
کہ ظاہر، پنجۂ خورشید، دستِ زیرِ پہلو ہے

اسدؔ، تا کے طبیعت طاقتِ ضبطِ الم لاوے؟
فغانِ دل بہ پہلو، نالۂ بیمار بدخو ہے

بدستِ آوردنِ دل گوہرِ دریائے شاہی ہے
وگرنہ خاتمِ دستِ سلیماں فلسِ ماہی ہے

سخن تاریک طبعوں کا ہے اظہارِ کثافت ہا
کہ زنگِ خامۂ فولاد، مانائے سیاہی ہے

خمیدن نشۂ مے میں، ہے شرمِ زشت اعمالی
دماغِ زہد میں آخر غرورِ بے گناہی ہے

نہیں ہے خالی آرائش سے بے سامانیٔ عاشق
شکستِ حال، اندازِ آفرینِ کج کلاہی ہے

اسدؔ، خوباں بھی دورِ چرخ سے رنجیدہ خاطر ہیں
گریباں چاکیٔ گلہا نشانِ دادخواہی ہے

نہ چھوڑو محفلِ عشرت میں جا، اے میکشاں خالی
کمیں گاہِ بلا ہے، ہو گیا شیشہ، جہاں خالی

نہ دوڑا ریشۂ دیوانگی صحنِ بیاباں میں
کہ تارِ جادہ سے ہے لجۂ ریگِ رواں خالی

دکانِ ناوکِ تاثیر ہے، از خود تہی ماندن
سراسر عجز ہو، کر خانہ مانندِ کماں خالی

محبت ہے نوا سازِ فغاں در پردۂ دلہا
کرے ہے مغز سے مانندِ نے کے استخواں خالی

عبث ہے، خطِ ساغر جلوہ، طوقِ گردنِ قمری
نمِ الفت سے ہے مینائے سروِ بوستاں خالی

نہ چھوڑو ریزشِ اعداد کی قطرہ فشانی پر
عزیزاں ہے بہ رنگِ صفرِ جامِ آسماں خالی

اسدؔ، ہنستے ہیں میرے گریہ ہائے زار پہ مردم
بھرا ہے دہر بے دردی سے، دل لیجے کہاں خالی

● ۶۱۸۱۶

ہوا جب حسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے
کہ بعد از صاف مے، ساغر میں دُردِ بادہ آتا ہے

نہیں ہے مزرعِ الفت میں حاصل غیرِ پامالی
نظر دانہ، سرِ خشک بر زمیں افتادہ آتا ہے

محیطِ دہر میں بالیدن، از ہستی گزشتن ہے
کریاں ہر یک، حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں
متاعِ زندگانیہا بغاوت دادہ آتا ہے

اسدؔ، وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں با دلِ آزادہ آتا ہے

۱۸۱۶ء

نگاہِ ناز نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی
دیا ابرو کو چھیڑا، اور اُس نے فتنے کو اشارت کی

روانی موجِ مے کی، گر، خطِ جامِ آشنا ہووے
لکھے کیفیت اُس سطرِ تبسم کی عبارت کی

شہِ گل نے کیا جب بندوبستِ گلشن آرائی
عصائے سبز دے نرگس کو دی خدمت نظارت کی

نہیں ریزش عرق کی، اب اُسے ذوبانِ اعضا ہے
تب خجلت نے یہ نبضِ رگِ گل میں حرارت کی

زبس نکلا غبارِ دل بوقتِ گریہ آنکھوں سے
اسدؔ کھائے ہوئے سرمے نے آنکھوں میں بصارت کی

۱۸۱۶ء

خدایا، دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خمِ گیسو ہو، شمشیرِ سیہ تاب اور شب کاٹے!

کریں گر قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق، خود آرایاں
صدف، دندانِ گوہر سے، بحسرت اپنے لب کاٹے

دریغا! وہ مریضِ غم کہ فرطِ ناتوانی سے
بقدرِ یک نفس جادہ، بصد رنج و تعب کاٹے

یقیں ہے، آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے

ہوئے یہ رہرواں دل خستہ شرمِ نارسائی سے
کہ دستِ آرزو سے یک قلم پائے طلب کاٹے

اسدؔ مجھ میں ہے اُس کے بوسۂ پا کی کہاں جرأت!
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے
کہ یہ گلزار باغِ رہ گذر ہے

جہاں شمعِ خموشی جلوہ گر ہے
پرِ پروانگاں بالِ شرر ہے

بجیبِ اشکِ چشمِ سرمہ آلودہ
مسی مالیدہ دندانِ گہر ہے

شفق ساں موجۂ خوں ہے اگر خواب
کہ مژگانِ کشودہ نیشتر ہے

کرے ہے روئے روشن آفتابی
غبارِ خطِ رخ، گردِ سحر ہے

ہوئی یک عمر صرفِ مشقِ نالہ — اثر موقوف بر عمرِ دگر ہے
اسدؔ ہوں میں پر افشانِ رمیدن — سوادِ شعر در گردِ سفر ہے

● ۱۸۱۶ء

بسکہ زیرِ خاک با آبِ طراوت راہ ہے — ریشے سے، ہر تخم کا دَلو، اندرونِ چاہ ہے
عکسِ گلہائے سمن سے چشمہ ہائے باغ میں — فلسِ ماہی آئینہ پردازِ داغِ ماہ ہے
واں سے ہے تکلیفِ عرضِ بیدماغی ہائے دل — یاں صریرِ خامہ، مجھ کو نالۂ جانکاہ ہے
حسن و رعنائی میں وہم صد سرو گردن ہے فرق — سرو کے قامت پہ، گل، یک دامنِ کوتاہ ہے
رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر، اسدؔ — پیچ و تابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے
اے اسدؔ، مایوس مت ہو از درِ شاہِ نجف — صاحبِ دلہا وکیلِ حضرتِ اللہ ہے

بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے — یک قلم، شاخِ گلِ نرگس، عصائے کور ہے
بزمِ خوباں، بسکہ جوشِ جلوہ سے پُر نور ہے — پشتِ دستِ عجز میاں ہر برگِ نخلِ طور ہے
ہوں، تصورہائے ہمدوشی سے، بدمستِ شراب — حیرتِ آغوشِ خوباں، ساغرِ بلّور ہے
ہے عجب مُردوں کو غفلت ہائے اہلِ دہر سے — سبزہ، جوں انگشتِ حیرت در دہانِ گور ہے
حسرت آبادِ جہاں میں ہے، الم، غم آفریں — نوحہ، گویا خانہ زادِ نالۂ رنجور ہے
کیا کروں؟ غم ہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار — دزد گر ہو خانگی، تو پاسباں معذور ہے
ہے زبا افتادگیِ نشۂ بیماری سے مجھے — بے سخن، تبخالۂ لب، دانۂ انگور ہے
جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفٰےؐ — اُس جگہ تختِ سلیماں، نقشِ پائے مور ہے
واں سے ہے تکلیفِ عرضِ بیدماغی ہا اور، اسدؔ — یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ رنجور ہے

● ۱۸۱۶ء

سوختگاں کی خاک میں ریزشِ نقشِ داغ ہے
آئنۂ نشانِ حال مثلِ گلِ چراغ ہے

لطفِ خمارِ مے کو ہے در دلِ ہمدگر اثر
پنبۂ شیشۂ شراب کفِ لبِ ایاغ ہے

مفتِ صفائے طبع ہے، جلوۂ نازِ سوختن
داغِ دلِ سیہ دلاں، مردمِ چشمِ زاغ ہے

رنجشِ یارِ مہرباں، عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اٹھے ہے جو غبار، گردِ سوادِ باغ ہے

شعر کی فکر کو، اسدؔ، چاہیے ہے دل و دماغ
وائے! کہ یہ فسردہ دل، بیدل و بیدماغ ہے

●

رباعیات

● ۱۸۱۶ء

ہرچند کہ دوستی میں کامل ہونا
ممکن نہیں یک زباں و یک دل ہونا
میں تجھ سے، اور مجھ سے تو پوشیدہ
ہے مفت، نگاہ کا مقابل ہونا

● ۱۸۱۶ء

بعد از دو سہ بزم عیدِ اطفال
ایّام جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیم عدم
اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال

● ۱۸۱۶ء

شب زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں؟ کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُرنم تھا

● ۱۸۱۶ء

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی! افسوس!
تکرار روا نہیں، تو تجدید سہی

● ۱۸۱۶ء

سامانِ ہزار جستجو، یعنی، دل!
ساغر کشِ خونِ آرزو، یعنی دل
پُشت و رُخِ آئینہ ہے، دین و دنیا
منظور ہے دو جہاں سے تو، یعنی دل

● ۱۸۱۶ء

اے کاش بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف — پہلوے حیات سے گزر جاتا صاف

اک تسمہ لگا رہا کہ تا روزے چند — رہیے نہ مشقّتِ گدائی سے معاف

● ۱۸۱۶ء

اے کثرتِ فہمِ بے شمار اندیشہ — ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ

یک قطرۂ خون، و دعوتِ صد نشتر — یک وہم، و عبادتِ ہزار اندیشہ

● ۱۸۱۶ء

بے گریہ کمالِ تر جبینی ہے مجھے — در بزمِ وفا خجل نشینی ہے مجھے

محرومِ صدا رہا بغیر از یک بار — ابریشمِ ساز، موے چینی ہے مجھے

● ۱۸۱۶ء

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں — رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں

ہیں نام و نگیں، کمیں گہِ نقبِ شعور — یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

● ۱۸۱۶ء

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے — وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے

یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد — ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

● ۱۸۱۶ء

گلخن، شررِ اہتمامِ بستر ہے آج — یعنی تبِ عشق شعلہ پرور ہے آج

ہوں دردِ بلاکِ نامہ بر سے بیمار — قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء

نسخۂ بھوپال

(مشمولۂ نسخۂ حمیدیہ)

۱۸۲۱ء

غزل

بعد از ۱۸۱۶ء

سمجھاؤ اُسے، یہ وضع چھوڑے
جو چاہے کرے، پہ دل نہ توڑے

تقریر کا اس کی حال مت پوچھ
معنی ہیں بہت، تو لفظ تھوڑے

نذرِ مژہ کر دل و جگر کو
چیرے ہی سے جائیں گے یہ پھوڑے

عاشق کو یہ چاہیئے کہ ہرگز
اندوہ سے (اپنا) منھ نہ موڑے

آ جا لبِ بام، کوئی کب تک؟
دیوار سے اپنے سر کو پھوڑے

جاتے ہیں رقیب کو خط اس کے
کاغذ کے دوڑتے ہیں گھوڑے

ق
غم خوار کو ہے قسم کہ زنہار
غالب کو نہ تشنہ کام چھوڑے

حسرت زدہ طرب ہے یہ شخص
دم جب کہ بہ وقتِ نزع توڑے

پانی نہ چوائے اس کے منھ میں
گل مے میں بھگو بھگو نچوڑے

قصائد

۱۸۲۱ء

۱

ساز یک ذرہ نہیں، فیضِ چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ، سویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے ہے، بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے، جامِ زمرد کی طرح، داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ، معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر، بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ، قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤسِ شکار

میکدے میں ہو، اگر، آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے، گوشۂ میخانہ میں گر تو، دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز، مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِ پرکار

لعل سی، کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا، منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا،
چشمِ جبریل، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن، و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف، و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے، حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اس گرد کا، خورشید کو، آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی، امید کو، احرامِ بہار

آفرینش کو ہے، واں سے طلبِ مستیٔ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار

مطلع

فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے، بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے، بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان، و دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے، جو چشم، نہ ہو آئینہ دار

دشمنِ آلِ نبیؐ کو، بطرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار

دیدہ تا دل، اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۲)

۱۸۲۱ء

م

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط، و نفعِ عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا، اثرِ نالۂ دلہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ "لاحول" لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر
"یا علی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو، وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو، نقشِ قدم اس کا، جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اُس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک، خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

برشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسل تو ہے، بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر، منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش، نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع، مگر، شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے، اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جاں و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں، کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے، مداحیِ ممدوحِ خدا!
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!؟

جنسِ بازارِ معاصی، اسداللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے، ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ، یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"

غمِ شبیرؑ سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو، الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے، اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب، و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست، و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا، اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ
وقفِ احباب، گُل و سنبلِ فردوسِ بریں

(۴)

(۱)

۱۸۲۱ء

سنگ، یہ کار گہِ ربطِ نزاکت ہے کہ ہے ۔۔۔ خندۂ بے خودیِ کبک، بدندانِ شرار

کشتۂ افعیِ زلفِ سیہِ شیریں کو ۔۔۔ بیستوں سبزے سے، ہے سنگِ زمرّد کا مزار
حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر ۔۔۔ سینہ، بے تابی سے، ملتا ہے بہ تیغِ کہسار
دشمنِ حسرتِ عاشق ہے، رگِ ابرِ سیاہ ۔۔۔ جس نے برباد کیا ریشۂ چندینِ شبِ تار

چشم بر چشم چھُٹے ہے بہ تماشا، مجنوں ۔۔۔ ہر دو سو خانۂ زنجیر، نگہ کا بازار
خانۂ تنگ، ہجومِ دو جہاں کیفیّت ۔۔۔ جامِ جمشید ہے یاں قالبِ خشتِ دیوار

سنبل و دام کمیں خانۂ خوابِ صیّاد ۔۔۔ نرگس و جامِ سیہ مستیِ چشمِ بیدار
طرّہ ہا، بسکہ گرفتارِ صبا ہیں، شانہ ۔۔۔ زانوے آئنہ پر مارے ہے دستِ بے کار
بسکہ یک رنگ ہیں دل، کرتی ہے ایجاد نسیم ۔۔۔ لالے کے داغ سے، جوں نقطہ و خط، سنبل زار
اے خوشا! فیضِ ہواے چمنِ نشو و نما ۔۔۔ بادہ پُر زور، و نفس مست، و مسیحا بیمار

ہمّت و نشو و نما میں یہ بلندی ہے کہ سرو ۔۔۔ پرِ قمری سے کرے صیقلِ تیغِ کہسار
ہر کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور ۔۔۔ غنچے کے میکدے میں مستِ تامّل ہے بہار
کس قدر عرض کروں ساغرِ شبنم، یارب؟ ۔۔۔ موجۂ سبزۂ نوخیز ہے لبریز خمار
غنچۂ لالہ، سیہ مستِ جوانی ہے ہنوز ۔۔۔ شبنمِ صبح، ہوئی رعشۂ اعضاے بہار
جوششِ بیدادِ تپش سے ہوئی عریاں آخر ۔۔۔ شاخِ گلگوں پہ، صبا، چھوڑ کے پیراہنِ خار
سازِ عریانیِ کیفیّتِ دل ہے، لیکن ۔۔۔ یہ مے تند، نہیں موج خرامِ اظہار
موجِ مے پر ہے، براتِ نگرانیِ امید ۔۔۔ گلِ نرگس سے کفِ جام پہ ہے چشمِ بہار

---

(۱) "یہاں اور آیندہ دو شعروں کے درمیان سادہ لکیر کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے میرزا صاحب نے کچھ شعر نکال کر دیوانِ متداول میں شامل کیے ہیں۔"

گلشن و میکدہ، سیلابیِ یک موجِ خیال نشہ و جلوۂ گل، ہر سوِ ہم فتنہ غبار

پشتِ لب، تہمتِ خط کھینچے ہے بے جا، یعنی سبزہ ہے، موجِ تبسم بہ ہوائے گفتار

جائے حیرت ہے کہ گلبازیِ اندیشۂ شوق اس زمیں میں نہ کرے سبز قلم کی رفتار

کسوتِ تاک میں ہے، نشۂ ایجادِ ازل سُبحۂ عرضِ دو عالم، بکفِ آبلہ دار
بہ نظرگاہِ گلستانِ خیالِ ساقی بیخودی، دامِ رگِ گل سے ہے پیمانہ شکار
بہ ہوائے چمنِ جلوہ، ہے طاؤس پرست باندھے ہے پیرِ فلک موجِ شفق سے زنار
یک چمن جلوۂ یوسف ہے بچشمِ یعقوب لالہ ہا داغ بر افگندہ و گلہا بے خار
بیضۂ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل سرو، بیدل سے عیاں، عکسِ خیالِ قدِ یار
عکسِ موجِ گل و سرشاریِ انداز حباب نگہِ آئنہ، کیفیتِ دل سے ہے دوچار
کس قدر ساز دو عالم کو ملی جراتِ ناز کہ ہوا، ساغرِ بے حوصلۂ دل، سرشار
ورنہ وہ ناز ہے، جس گلشنِ بیداد سے تھا طورہ، مشعلِ بکف از جلوۂ تنزیہ بہار
سایۂ تیغ کو دیکھ اس کے، بہ ذوقِ یک زخم سینۂ سنگ پہ کھینچے ہے الف، بالِ شرار
بتکدہ، بہرِ پرستشگریِ قبلۂ ناز باندھے زنارِ رگِ سنگ، میانِ کہسار
سُبحہ گرداں ہے اسی کی کفِ امید کا، ابر یم سے جس کے، صبا، توڑے ہے صد جا زنار
رنگریزِ گل و جامِ دو جہاں ناز و نیاز اولیں دورِ امامت، طربِ ایجادِ بہار
جوشِ طوفانِ کرم، ساقیِ کوثر ساغر نُہ فلک، آئنۂ ایجادِ کفِ گوہربار
پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابری، نیساں یہ تُنک مایہ، ہے فریادیِ جوشِ ایثار

پر یہ دولت، تھی نصیبِ نگہِ معنیِ ناز کہ ہوا صورتِ آئینہ میں، جوہر، بیدار

اے خوشا مکتبِ شوق و بلدستانِ مراد سبقِ نازکی، ہے عجز کو صد جا، تکرار
مشقیِ نقشِ قدم، نسخۂ آبِ حیواں جادۂ دشتِ نجف، عمرِ خضر کا طومار
جلوہ تمثال ہے، ہر ذرۂ نیرنگ سواد بزمِ آئینۂ تصویر نما، مشتِ غبار

دو جہاں طالبِ دیدار تھا، یارب کہ، ہنوز — چشمکِ ذرّہ سے ہے گرم، نگہ کا بازار
ہے، نفس، مایۂ شوقِ دو جہاں ریگِ رواں — پائے رفتار کم، و حسرتِ جولاں بسیار

دشتِ الفت چمن، و آبلہ مہماں پرور — دلِ جبریل، کفِ پا پہ ملے ہے رخسار
یاں تلک انصاف نوازی کر اگر ریزۂ سنگ — بے خبر دے بکفِ پائے مسافر آزار
یک بیاباں تپشِ بالِ شرر سے، صحرا — مغزِ کہسار میں کرتا ہے فرو، نشترِ خار
فرش اس دشتِ تمنا میں نہ ہوتا، گر عدل — گرمیِ شعلۂ رفتار سے جلتے خس و خار
ابرِ نیساں سے ملے موجِ گہر کا تاوان — خلوتِ آبلہ میں گم کرے، گر تو، رفتار
یک جہاں بسملِ اندازِ پر افشانی ہے — دام سے اُس کے، قضا کو ہے رہائی دشوار
موجِ طوفانِ غضب، چشمۂ نہ چرخ حباب — ذوالفقارِ شہِ مرداں، خطِ قدرت آثار
موجِ ابروئے قضا جس کے تصور سے، دو نیم — بیم سے جس کے، دلِ شحنۂ تقدیر، فگار
شعلہ تحریر سے اس برق کی، ہے کلکِ قضا — بالِ جبریل سے مسطر کشِ سطرِ زنہار
موجِ طوفاں ہو، اگر خونِ دو عالم ہستی — ہے حنا کو سرِ ناخن سے گزرنا دشوار
دشتِ تسخیر ہو، گر گردِ خرامِ دلدل — نعل در آتش ہر ذرہ ہے، تیغِ کہسار
بالِ رعنائیِ دم، موجۂ گلبندِ قبا — گردشِ کاسۂ سُم، چشمِ پری آئنہ دار
گردِ رہ اُس کی بھرے شیشۂ ساعت میں اگر — ہر نفس راہ میں ٹوٹے، نفسِ لیل و نہار
نرم رفتار ہو جس کوہ پہ وہ برق گداز — رفتنِ رنگِ حنا ہے، تپشِ بالِ شرار
ہے سراسر روی عالمِ ایجاد اُسے — جیبِ خلوتکدۂ غنچہ میں، جولانِ بہار
جس کے حیرتکدۂ نقشِ قدم میں، مانی — خونِ صد برق سے باندھے بکفِ دست نگار
ذوقِ تسلیمِ تمنا سے بہ گلزارِ حضور — عرضِ تسخیرِ تماشا سے بہ دامِ اظہار
مطلعِ تازہ ہوا موجۂ کیفیتِ دل — جامِ سرشارِ مے و غنچۂ لبریز بہار

گردِ جولاں سے ہے تیری، جگر یانِ خرام — جلوۂ طور، نمک سودۂ زخمِ تکرار
جس چمن میں ہو، ترا جلوۂ محروم نواز — پرِ طاؤس، کرے گرم نگہ کا بازار
جس ادب گاہ میں تو آئنۂ شوخی ہو — جلوہ، ہے ساقیِ مخموریِ تابِ دیوار

تو وہ ساقی ہے کہ ہر موجِ محیطِ تنزیہ — کھینچے خمیازے میں تیرے لبِ ساغر کا خمار
گرد باد آئنہ فتنواکِ دماغِ دلہا — تیرا صحرائے طلب، محفلِ پیمانہ شکار
ذوقِ بے تابیِ دیدار سے تیرے، ہے ہنوز — جوشش جوہر سے، دلِ آئنہ، گلدستۂ خار

تیرا پیمانۂ مے، نسخۂ ادوارِ ظہور — تیرا نقشِ قدم، آئینہ شانِ اظہار
آیتِ رحمتِ حق، بسملۂ مصحفِ ناز — مسطرِ موجۂ دیباچۂ درسِ اسرار
قبلۂ نورِ نظر، کعبۂ اعجازِ مسیح — مژۂ دیدۂ نخچیر سے، نبضِ بیمار
تہمتِ بیخودیِ کفر نہ کھینچے، یارب — کمیِ ربطِ نیاز، وخطِ نازِ بسیار
نازِ پروردۂ صد رنگ تمنا ہوں، و لے — پرورش پائی ہے، جوں غنچہ، بخونِ اظہار
تنگیِ حوصلہ، گردابِ دو عالم آداب — دیدِ یک غنچہ سے ہوں بسملِ نقصانِ بہار
رشکِ نظارہ تھی یک برقِ تجلی کہ ہنوز — تشنۂ خونِ دو عالم ہوں، بعرضِ تکرار
وحشتِ فرصتِ یک جیب کشش نے کھویا — صورتِ رنگِ حنا، ہاتھ سے دامانِ بہار
شعلہ آغاز، و لے حیرتِ داغِ انجام — موجِ مے لیک ز سر تا قدم آغوشِ خمار
ہے اسیرِ ستمِ کشمکشِ دامِ وفا — دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملت بیزار
مژۂ خواب سے کرتا ہوں، بآسایشِ درد — بخیۂ زخمِ دلِ چاک، بیکدستہ شرار
محرمِ دردِ گرفتاریِ مستی معلوم — ہوں نفس سے، صفتِ نغمہ، بہ بندِ رگِ تار
تھا سرِ سلسلہ جنبانیِ صد عمرِ ابد — سازِ بامغت بہ ریشم کدۂ نالۂ زار
لیکن اس رشتۂ تحریر میں سر تا سرِ فکر — ہوں، بہ قدرِ عددِ حرفِ علی سبحہ شمار
دوست اس سلسلۂ ناز کے، جوں سنبل و گل — ابرِ میخانہ کریں ساغرِ خورشید شکار
لنگرِ عیش بہ سرشارِ تماشائے دوام — کر رہے خونِ خزاں سے بہ حنا پائے بہار
زلفِ معشوق کشش، سلسلۂ وحشتِ ناز — دلِ عاشق، شکن آموزِ خمِ طرۂ یار
مئے تمثال پری، نشۂ مینا آزاد — دلِ آئینہ طرب، ساغرِ بختِ بیدار

---

(۴)

۱۸۲۱ء

توڑے ہے عجزِ تنگ حوصلہ، بر روے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ، کہیں جس کو جبیں
توڑے ہے نالہ، سرِ رشتۂ پاسِ انفاس
سر کرے ہے، دلِ حیرت زدہ، شغلِ تسکیں

یاس، تمثالِ بہار آئنۂ استغنا
وہم، آئینۂ پیدائیِ تمثالِ یقیں
خوں ہوا، جوششِ تمنا سے، دو عالم کا دماغ
بزمِ یاس، آں سوے پیدائی و اخفا رنگیں

خانہ ویرانیِ امید و پریشانیِ بیم
جوششِ دوزخ، ہے خزانِ چمنِ خلدِ بریں

بادِ افسانۂ بیمار ہے، عیسیٰ کا نفس
استخواں ریزۂ موراں ہے سلیماں کا نگیں

موجِ خمیازۂ یک نشہ، چہ اسلام، و چہ کفر
کجیِ یک خطِ مسطر، چہ توہم، چہ یقیں
قبلہ و ابروے بت، یک رہِ خوابیدۂ شوق
کعبہ و بتکدہ، یک محملِ خوابِ رنگیں

عیشِ بسمل کدۂ عیدِ حریفاں معلوم
خوں ہو آئینہ، کہ ہو جامۂ طفلاں رنگیں

نزع مخمور ہوں اُس دید کی دُھن میں کہ مجھے
رشتۂ سازِ ازل ہے، نگہِ باز پسیں
حیرت، آفت زدۂ عرضِ دو عالم نیرنگ
مومِ آئینۂ ایجاد ہے، مغزِ تمکیں
وحشتِ دل سے پریشاں ہے، چراغانِ خیال
باندھوں ہوں آئنے پر چشمِ پری سے آئیں
کوچہ دیتا ہے پریشاں نظری پر صحرا
رمِ آہو کو ہے ہر ذرّے کی چشمک میں کمیں
چشمِ امید سے گرتے ہیں، دو عالم، جوں اشک
یاس پیمانہ کشِ گریۂ مستانہ نہیں
کس قدر فکر کو ہے نالِ قلم موے دماغ
کہ ہوا خوں نگہِ شوق میں، نقشِ تمکیں
عذرِ لنگ، آفتِ جولانِ ہوس ہے، یارب
جل اٹھے گرمیِ رفتار سے، پاے چوبیں
نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے، آئینۂ دل پردہ نشیں

کھینچوں ہوں آئینے پر خندۂ گل سے مسطر — نامہ، عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں
رنجِ تعظیمِ مسیحا نہیں اٹھتا مجھ سے — درد ہوتا ہے مرے دل میں، جو توڑوں بالیں
بس کہ گستاخیِ اربابِ جہاں سے ہوں ملول — پرِ پروانہ، مری بزم میں ہے خنجرِ کیں
اے عبارت، تجھے کس خط سے ہے درسِ نیرنگ — اے نگہ، تجھ کو ہے کس نقطے میں مشقِ تمکیں؟

جلوۂ ریگِ رواں دیکھ کے گردوں ہر صبح — خاک پر توڑے ہے آئینۂ نازِ پرویں
شورِ اوہام سے مت ہو شبِ خونِ انصاف — گفتگو بے مزہ، و زخمِ تمنا نمکیں
ختم کر ایک اشارت میں عباراتِ نیاز — جوں مہِ نو، ہے نہاں گوشۂ ابرو میں، جبیں

معنیِ لفظِ کرم، بسملۂ نسخۂ حسن — قبلۂ اہلِ نظر، کعبۂ اربابِ یقیں
جلوہ رفتارِ سرِ جادۂ شرعِ تسلیم — نقشِ پا جس کا ہے توحید کو معراجِ جبیں

کوہ کو، بیم سے، اُس کے، ہے جگر باختگی — نہ کرے نذرِ صدا، ورنہ، متاعِ تمکیں

وصفِ دُلدُل، ہے مرے مطلعِ ثانی کی بہار — جنتِ نقشِ قدم سے ہوں، میں اس کی گلچیں
گردِ رہ، سرمہ کشِ دیدۂ اربابِ یقیں — مطلع — نقشِ ہر گام، دو عالم صفہاں زیرِ نگیں
برگِ گل کا، ہو جو طوفانِ ہوا میں عالم — اُس کے جولاں میں نظر آئے ہے یوں، دامنِ زیں
اُس کی شوخی سے بہ حیرت کدۂ نقشِ خیال — فکر کو حوصلۂ فرصتِ ادراک نہیں
جلوۂ برق سے ہو جائے نگہ، عکس پذیر — اگر آئینہ بنے حیرتِ صورت گرِ چیں

ذوقِ گلچینیِ نقشِ کفِ پا سے تیرے — عرش چاہے ہے کہ ہو در پہ ترے خاک نشیں
تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے، ولیکن بہ تضاد — وصیِ ختمِ رسل تو ہے باثباتِ یقیں

دادِ دیوانگیِ دل کہ ترا مدحت گر — ذرّے سے باندھے ہے خُرشیدِ فلک پر آئیں

(۵)

۱۸۲۱ء

بہ گمانِ قطعِ زحمت نہ دو چار خامشی ہو
کہ زبانِ سرمہ آلود نہیں تیغِ اصفہانی

بفریبِ آشنائی، بخیالِ بے وفائی
نہ رکھ آپ سے تعلق، مگر ایک بدگمانی

نظرے سوئے کہستاں کہ نہیں غیرِ شیشہ ساماں
جو گدازِ دل ہو مطلب تو چمن ہے سنگ جانی

بفرازِ گاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا؟
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی

بہ فراقِ رفتہ یاراں، خط و حرف، موپریشاں
دلِ غافل از حقیقت، ہمہ ذوقِ قصہ خوانی

تپشِ دلِ شکستہ، پئے عبرت، آگہی ہے
کہ نہ دے عنانِ فرصت بکشاکشِ زبانی

نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تمیز جو ہے
چہ حسابِ جانفشانی؟ چہ غرورِ دلستانی؟

بہ شکنجِ جستجوہا، بہ سرابِ گفتگوہا
تگ و تازِ آرزوہا، بہ فریبِ شادمانی

نہیں شاہراہِ اوہام، بجز آں سوئے رسیدن
تری سادگی ہے. غافل، درِ دل پہ پاسبانی

چہ امید و ناامیدی؟ چہ نگاہ و بے نگاہی؟
ہمہ عرضِ ناشکیبی؟ ہمہ سازِ جاں ستانی

اگر آرزو ہے راحت، تو عبث بخوں تپیدن
کہ خیال ہو تعب کش بہ ہوائے کامرانی

شر و شورِ آرزو سے تب و تابِ عجز بہتر
بکرے اگر ہوس ہے، غمِ بیدلی، گرانی

ہوسِ فروختن ہا، تب و تاب سوختن ہا
سرِ شمع نقشِ پا ہے، بسپاسِ ناتوانی

شررِ اسیرِ دل کو ملے اوجِ عرضِ اظہار
جو بہ صورتِ چراغاں کرے، شعلہ زبانی

ہوئے مشقِ جرأتِ ناز، رہ و رسمِ طرحِ آداب
خمِ پشت خوشنما تھا بجز آرشِ جوانی

اگر آرزو رسا ہو، پئے دردِ دل دوا ہو
وہ اجل کہ خوں بہا ہو، بہ شہیدِ ناتوانی

غمِ عجز کا سفینہ بہ کنارِ بیدلی ہے
مگر ایک شہپرِ مور کرے سازِ بادبانی

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

دلِ ناامید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو
جو امیدوار رہیے، نہ بہ مرگِ ناگہانی

مجھے بادۂ طرب سے بخمار گاہِ قسمت
جو ملی تو تلخکامی، جو ہوئی تو سرگرانی

نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہاں تھی
مجھے طاقت آزمانی، تجھے الفت آزمانی

بہ ہزار امیدواری رہی ایک اشک باری
نہ ہوا حصولِ زاری، بجز آستیں فشانی

کروں عذرِ ترکِ صحبت، ہو کہاں وہ بیدماغی؟ — نہ غرورِ میرزائی، نہ فریبِ ناتوانی
ہمہ یک نفس تپش سے تب و تابِ ہجر مت پوچھ — کہ ستم کشِ جنوں ہوں نہ بقدرِ زندگانی
کفِ موجۂ حیا ہوں، بگزارِ عرضِ مطلب — کہ سرشکِ قطرہ زن ہے بہ پیامِ دل رسانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ — کروں عوانِ گفتگو پہ دل و جاں کی میہمانی

غزلیات

۱۸۲۱ء

عالم، جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا — جوں صبح، چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا
بازی خورِ فریب ہے، اہلِ نظر کا ذوق — ہنگامہ، گرمِ حیرتِ بود و نمود تھا
عالم، طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سر بسر — یا میں غریبِ کشورِ گفت و شنود تھا
جز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار — م — صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — م — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ — م — جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا
لیتا ہوں، مکتبِ غمِ دل میں، سبق ہنوز — م — لیکن یہی کہ "رفت" "گیا" اور "بود" "تھا"
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — م — میں، ورنہ، ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ — م — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

۱۸۲۱ء

تنگی رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا — میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر، کہ میں — حیرت متاعِ عالمِ نقصان و سود تھا
گردش محیطِ ظلم رہا جس قدر، فلک — میں پائمالِ غمزۂ چشمِ کبود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر — کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
خور، شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدؔ — سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

۱۸۲۱ء

کہتے ہو: "نہ دیں گے ہم" دل اگر پڑا پایا م دل کہاں کہ گم کیجیے؟ ہم نے مُدّعا پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم، یا رب؟ م ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے؟ م ایک بے کسی، تجھ کو عالم آشنا پایا

خاکبازیِ امید، کارخانۂ طفلی م یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

کیوں نہ وحشتِ غالبؔ باج خواہِ تسکیں ہو؟ م کشتۂ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا

۱۸۲۱ء

عشق سے طبیعت نے، زیست کا مزا پایا م درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم م آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری م حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل م خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر، یعنی م ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا م آپ سے کوئی پوچھے "تم نے کیا مزا پایا؟"

فکرِ نالہ میں، گویا، حلقہ ہوں زِ سر تا پا م عضو عضو، جوں زنجیر، یک دلِ صدا پایا

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اُس کا م صبح، موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادنِ گل ہے م زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دلکشا پایا

ہے نگیں کی پاداری، نامِ صاحبِ خانہ م ہم سے تیرے کوچے نے نقشِ مدعا پایا

نَے اسدؔ جفا سائل، نَے ستم جنوں مائل م تجھ کو جس قدر ڈھونڈھا الفت آزما پایا

۱۸۲۱ء

شوق، ہر رنگ، رقیبِ سروساماں نکلا م قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب! م تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل م جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذتِ درد م کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
تھی نوآموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند م سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب م آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

● ۱۸۲۱ء

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا م ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
نہ ہوئی ہم سے رقم حیرتِ خطِّ رخِ یار صفحۂ آئنہ، جولانگہِ طوطی نہ ہوا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا م یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں م وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل، گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی م گر نفَس، جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی م گوش، منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے؟ م ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب م ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

● ۱۸۲۱ء

جب، بتقریبِ سفر، یار نے محمل باندھا م تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز م جوہرِ آئنہ کو طوطیِ بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا م عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں، غالب م گرچہ دل کھول کے، دریا کو بھی ساحل باندھا

● ۱۸۲۱ء

ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ رنگ نے آئنہ آنکھوں کے مقابل باندھا

اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نہ کھولی، اُسے مشکل باندھا

نوکِ ہر خار سے تھا بسکہ سرِ دزدیِ زخم
جوں نمد، ہم نے کفِ پا پہ، اسدؔ دل باندھا

● ۱۸۲۱ء

کارخانے سے جنوں کے بھی، میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے، ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار، بلا آئنہ ساماں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں، یارب
نقشِ ہر ذرّہ، سُوَیدائے بیاباں نکلا

شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا، پر وہی عریاں نکلا

شوخیِ رنگِ حنا، خونِ وفا سے، کب تک؟
آخر، اے عہد شکن، تو بھی پشیماں نکلا

جوہرِ ایجادِ خطِ سبز ہے، خود بینیِ حسن
جو نہ دیکھا تھا، سو آئینے میں پنہاں نکلا

میں بھی معذورِ جنوں ہوں، اسدؔ، اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

● ۱۸۲۱ء

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا م
حبابِ موجۂ رفتار ہے، نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے م
کہ موجِ بوئے گُل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا

رہِ خوابیدہ، تھی گردن کشِ یک درسِ آگاہی
زمیں کو سیلیِ اُستاد ہے، نقشِ قدم میرا

سراغِ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں
پر افشاں ہے غبار، آنسوئے صحرائے عدم، میرا

نہ ہو وحشت کشِ درسِ سرابِ سطرِ آگاہی
غبارِ راہ ہوں، بے مدعا ہے پیچ و خم میرا

ہوائے صبح، یک عالم گریباں چاکیِ گُل ہے
دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا

اسدؔ، وحشت پرستِ گوشۂ تنہائیِ دل ہوں
برنگِ موجِ مے، خمیازۂ ساغر ہے، رم میرا

ضعفِ جنوں کو، وقتِ تپش، در بھی دور تھا
اک، گھر میں، مختصر سا بیاباں ضرور تھا

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق! ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا

درسِ تپش ہے برق کو اب جس کے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات، ماہ کا لبریزِ نور تھا

جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر
جوہر سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے م
صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو، اپنے ہاتھ سے، گردن نہ ماریے م
اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

١٨٢١ء

خود پرستی سے، رہے باہمدگر ناآشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

آتشِ موئے دماغِ شوق ہے، تیرا تپاک
ورنہ ہم کس کے ہیں، اے داغِ تمنا، آشنا!

جوہرِ آئینہ، جز رمزِ سرِ مژگاں نہیں
آشنائی، ہمدگر سمجھے ہے، ایما آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں، اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا!

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف! م
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا!

ذرہ ذرہ، ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے م
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلا آشنا

شوق، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز م
ذرہ صحرا دستگاہ، و قطرہ دریا آشنا

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے م
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے م
میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، اسد م
سنگ سے، سر مار کر، ہووے نہ پیدا آشنا

١٨٢١ء

شب، خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا م
تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے، درسِ دفترِ امکاں کھلا م
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ دشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟ م خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن م دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیے، اوراقِ لختِ دل، بہ باد م یادگارِ نالہ، یک دیوانِ بے شیرازہ تھا
ہوں چراغانِ ہوس، جوں کاغذِ آتش زدہ م داغ، گرمِ کوششِ ایجادِ داغِ تازہ تھا
بے نوائی تر صدائے نغمۂ شہرت، اسد م بوریا، یک نیستاں عالمِ بلند دروازہ تھا

١٨٢١ء

وہ مری چینِ جبیں سے، غمِ پنہاں سمجھا م رازِ مکتوب، بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز م چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ م اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام م رخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا م نبضِ خس سے، تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی م ہر قدم، سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تا دمِ مرگ م دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے، کیوں، اسکو وفادار، اسد؟ م غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

١٨٢١ء

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا م گہر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب م مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی م دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیشِ دنیا کا
ملی نہ وسعتِ جولان یک جنوں ہم کو م عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا
مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے م میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو م مجھے، دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا
ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں م کرے ہے، ہر بُنِ مُو، کام چشمِ بینا کا
دل اُس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے، دے بیٹھے م ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا؟
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے م مری نگاہ میں ہے، جمع خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد، اسدؔ م جفا میں اُس کی، ہے اندازِ کارفرما کا

● ۱۸۲۱ء

کس کا جنونِ دید، تمنّا شکار تھا؟ آئینہ خانہ، وادیٔ جوہر غبار تھا
کس کا خیال، آئینۂ انتظار تھا ہر برگِ گُل کے پردے میں دل بیقرار تھا
ایک ایک قطرے کا، مجھے دینا پڑا حساب م خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو م توڑا جو تو نے آئنہ، تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ میں م جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال م ہر ذرہ، مثلِ جوہرِ تیغ، آبدار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب م دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا
جوں غنچہ و گُل، آفتِ فالِ نظر نہ پوچھ پیکاں سے تیرے، جلوۂ زخم، آشکار تھا
دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر خمیازہ، یک درازیٔ عمرِ خمار تھا
صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی، اسدؔ جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

● ۱۸۲۱ء

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا م آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی م در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

واے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دم مجھکو م آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ، ازبس کہ تقاضاے نِگہ کرتا ہے م جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مِژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ م عیدِ نظّارہ ہے، شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّاے نشاط م تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنّا کھانا م لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمک داں ہونا
کی مرے قتل کے بعد، اُس نے جفا سے توبہ م ہاے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف! اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت، غالب م جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۱۸۲۱ء

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا م دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز م پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہاے تمنّا، یعنی م پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل م نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی م کیوں ترا راہگزر یاد آیا؟
آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں م دل سے تنگ آکے، جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال م دلِ گم گشتہ، مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے م دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی م گھر ترا، خلد میں گر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسد م سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۱۸۲۱ء

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر، نہ ہوا تھا م اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا، مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے م خورشید، ہنوز، اُس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے، ازل سے م آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم م میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں م یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک م میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی، اسدؔ، داغِ جگر سے مری تحصیل م آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

● ۱۸۲۱ء

نفَس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ م اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ م برنگِ خار، مرے آئنے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل م کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت، نظارۂ نرگس م بکوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ، ادا کر حقِ ودیعتِ ناز م نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں م بہ روئے سفرہ، کبابِ دلِ سمندر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں م اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرّر کھینچ
جنونِ آئنہ، مشتاقِ یک تماشا ہے م ہمارے صفحے پہ بالِ پری سے مسطر کھینچ
خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے، اسدؔ م دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

● ۱۸۲۱ء

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد م بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے، کوئی، قابل نہ رہا م ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد
شمع بجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے م شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر، یعنی م ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد
درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو جا م نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا، میرے بعد

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے ۰ آغوشِ وداع م چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردانگیِ عشق، م ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا، میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی م کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد
تھی، نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب م بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا، میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ م متفرق ہوئے میرے رُفقا، میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا، غالب م کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا، میرے بعد

● ۱۸۲۱ء

بلا سے، ہیں جو بہ پیشِ نظر در و دیوار م نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ م کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار م گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ! م کہ مست ہیں ترے کوچے میں، ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ م کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر، در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟ م کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر، در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں، تو سائے سے م ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے، گھر کی آبادی م ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر، در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب م کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر، در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں م حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

● ۱۸۲۱ء

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر م میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی م سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اُس زمانے سے م کہ مجنوں "لام الف" لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے م بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا م کہ پشتِ چشم سے جس کے، نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا! م کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
دلِ خونیں جگر بے صبر، و فیضِ عشق مستغنی! الٰہی یک قیامت خاور آ ٹوٹے بدخشاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا! م قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے، غالبؔ، کیا ہوا، گر اُس نے شدت کی م ہمارا بھی تو آخر، زور چلتا ہے گریباں پر

۱۸۲۱ء

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز م دعا قبول ہو، یا رب، کہ "عمرِ خضر دراز!"
نہ ہو، بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجود م ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں؟ م کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرواز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست م گئی نہ، خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں، غالبؔ م جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز
فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ نگاہ عکس فروش، و خیال آئنہ ساز
ہنوز، اے اثرِ دید، ننگِ رسوائی نگاہ فتنہ خرام، و درِ دو عالم باز
زبسکہ جلوۂ صیاد حیرت آرا ہے اڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز
ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزاں ہے کہ شیشہ نازک، و صہبا ہے آبگینہ گداز
اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں، وہ معنی ہے کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

۱۸۲۱ء

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز م میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل م میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی م ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد م ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستم گر سے م ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں م جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ! یک قلم انگیز! م اے ترا ظلم سربسر انداز
تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو م ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا م میں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا م اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

● ۱۸۲۱ء

کب فقیروں کو رسائی بتِ مےخوار کے پاس م تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس
مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، ہے ہے م خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے م دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غم خوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن، اے دل م نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے م خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس
مژدہ، اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے! م دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا! م جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مر گیا، پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی، ہے ہے م بیٹھنا اُس کا وہ، آکر، تری دیوار کے پاس

● ۱۸۲۱ء

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا نمک م کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار، ہے سامانِ نازِ زخمِ دل م ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے! تجھ کو مبارک ہو جیو! م نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج م گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ! م یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے م دل طلب کرتا ہے زخم، اور مانگے ہے اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد! م زخم، مثلِ خندۂ قاتل، ہے سرتاپا نمک
اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی، اسد زورِ نسبت مے سے رکھتا ہے، نصاریٰ کا نمک
یاد ہیں، غالب، تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں م زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

● ۱۸۲۱ء

آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہوتے تک م کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہوتے تک؟
دامِ ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کامِ نہنگ م دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ، گہر ہوتے تک
عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب م دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن م خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک
پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم م میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہوتے تک
یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل م گرمیِ بزم ہے، اک رقصِ شرر ہوتے تک
تا قیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں، سحر ہوتے تک
غمِ ہستی کا، اسد، کس سے ہو، جز مرگ، علاج؟ م شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

● ۱۸۲۱ء

رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ، ہم شعلہ ہا نذرِ سمندر، بلکہ آتش خانہ، ہم
حسرتِ عرضِ تمنا یاں سے سمجھا چاہیے دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں، جوں شانہ، ہم
کشتیِ عالم بہ طوفانِ تغافل دے، کہ ہیں عالمِ آبِ گدازِ جوہرِ افسانہ، ہم
وحشتِ بے ربطیِ پیچ و خمِ ہستی نہ پوچھ ننگِ بالیدن ہیں، جوں موئے سرِ دیوانہ، ہم

۱۸۲۱ء

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں — میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں
حسنِ افسردہ دلی ہا رنگیں — شوق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی — وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
قید میں بھی ہے، اسیری، آزاد — چشمِ زنجیر کو وا باندھتے ہیں
شیخ جی، کعبے کا جانا معلوم — آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
کس کا دل زلف سے بھاگا؟ کہ اسدؔ — دستِ شانہ بہ قضا باندھتے ہیں

۱۸۲۱ء

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں م ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا، کس نے، اثر دیکھا ہے؟ م ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل، اے عمر م برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم م اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے، واشدِ گل م مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ م لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں م آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پرکار ہیں خوباں، غالبؔ م ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۱۸۲۱ء

طاؤس نمط، داغ کے گر رنگ نکالوں — یک فردِ نسب نامۂ نیرنگ نکالوں
کو تیزیِ رفتار؟ کہ صحرا سے زمیں کو — جوں قمریِ بسمل تپشِ آہنگ نکالوں

دامانِ شفق، طرفِ نقابِ مہِ نو ہے
ناخن کو جگر کاوی میں بے رنگ نکالوں

کیفیتِ دیگر ہے، فشارِ دلِ خونیں!
یک غنچہ سے صد خُمِ مَے گل رنگ نکالوں

پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوں، اے رشک
محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

گر ہو بلدِ شوق مری خاک کو وحشت
صحرا کو بھی گھر سے کئی فرسنگ نکالوں

فریاد! اسدؔ، غفلتِ رسوائیِ دل سے
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں

● ۱۸۲۱ء

کیا ضعف میں اُمّید کو دل تنگ نکالوں؟
میں خار ہوں، آتش میں یا چبھوں، رنگ نکالوں

نے کوچۂ رسوائی و زنجیرِ پریشاں
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں؟

یک نشوونما جا نہیں جولانِ ہوس کو
ہرچند بقدارِ دلِ تنگ نکالوں

گر جلوۂ خورشید خریدارِ وفا ہو
جوں ذرّہ، صد آئینۂ بے زنگ نکالوں

افسردۂ تمکیں ہے، نفس گرمیِ احباب
پھر شیشے سے عطرِ شررِ سنگ نکالوں

ضعف، آئنہ پردازیِ دستِ دگراں ہے
تصویر کے پردے میں مگر رنگ نکالوں

ہے غیرتِ الفت کہ، اسدؔ، اُس کی ادا پر
گر دیدہ و دل صلح کریں، جنگ نکالوں

● ۱۸۲۱ء

بقدرِ لفظ و معنی، فکرت احرام گریباں ہیں
وگرنہ کیجیے جو ذرّہ عریاں، ہم نمایاں ہیں

عروجِ نشّۂ واماندگی پیمانہ محمل تر
برنگِ ریشۂ تاک، آبلے، جادے میں پنہاں ہیں

بہ وحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے
مہ و خورشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں

نہ انشا معنیِ مضموں، نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا، ہرزہ عنواں ہیں

طلسمِ آفرینش، حلقۂ یک بزمِ ماتم ہے
زمانے کے، شبِ یلدا سے، موئے سر پریشاں ہیں

یہ کس بے مہر کی تمثال کا ہے جلوہ سیمابی
کہ مثلِ ذرّہ ہائے خاک، آئینے پرافشاں ہیں

مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ، مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں

اسدؔ، بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے، تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عریاں ہیں

۱۸۲۱ء

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں م ایک چکّر ہے مرے پانو میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں م جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر، نہیں
حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے م جادۂ راہِ وفا، جز دمِ شمشیر، نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو! م خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر، نہیں
سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے م لذّتِ سنگ، بہ اندازۂ تقریر، نہیں
جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے م کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر، نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ م "آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر، نہیں"
آئنہ دام کو سبزے میں چھپاتا ہے عبث کہ پری زادِ نظر، قابلِ تسخیر، نہیں
مثلِ گل، زخم ہے میرا بھی سناں سے توام تیرا ترکش ہی کچھ آبستنیِ تیر، نہیں
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا، غالب؟ جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا م تعجب سے وہ بولا: "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"
دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے، غالب م نہ کر سرگرم اُس کافر کو الفت آزمانے میں

۱۸۲۱ء

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی، ایک دن م ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو م اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی، ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں م رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل، غنیمت جانیے م بے صدا ہو جائے گا، یہ سازِ ہستی، ایک دن
دھول دھپّا، اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں م ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالب، پیش دستی ایک دن

۱۸۲۱ء

رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو
تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو

پرواز نقدِ دامِ تمنائے جلوہ تھا
طاؤس نے اک آئینہ خانہ رکھا گرو

عرضِ بساطِ انجمنِ رنگ مفت ہے
موجِ بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو

ہر ذرّہ خاک عرضِ تمنائے رفتگار
آئینہ ہا شکستہ، و تمثالہا گرو

ہے تاک میں سکلمِ ہوسِ صد قدح شراب
تسبیحِ زاہداں، بکفِ مدّعا گرو

برق آبیارِ فرصتِ رنگِ دمیدہ ہوں
جوں نخلِ شمع، ریشے ہیں نشو و نما گرو

طاقت، بساطِ دستگہِ یک قدم نہیں
جوں اشک، جب تلک نہ رکھوں دست و پا گرو

ہے وحشتِ جنونِ بہار اس قدر کہ ہے
بالِ پری، بشوخیِ موجِ صبا گرو

بیتاب سیرِ دل ہے، سرِ ناخنِ نگار
یاں نعل ہے بآتشِ رنگِ حنا گرو

ہوں سخت جان کاوشِ فکرِ سخن، اسد
تیشے کی، کوہسار میں ہے، یک صدا گرو

۱۸۲۱ء

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب! دل نہ سمجھ، بلا سمجھ

رنگِ رواں و ہر تپش درسِ تسلیِ شعاع
آئینہ توڑ، اے خیال، جلوے کو خوں بہا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

شوقِ عناں گسل اگر درسِ جنوں ہوس کرے
جادۂ سیرِ دو جہاں، یک مژہ خواب پا سمجھ

گاہ بخلد امیدوار، گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفتِ ما سوا سمجھ

اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دارِ ہمدگر
خار کو بے نیامِ جاں، ہم کو برہنہ پا سمجھ

نغمۂ بے دلاں، اسد، سازِ فسانگی نہیں
بسملِ دردِ خفتہ ہوں، گریے کو ماجرا سمجھ

۱۸۲۱ء

کلفتِ ربطِ این و آں، غفلتِ مدّعا سمجھ
شوق کرے جو سرگراں، محملِ خوابِ پا سمجھ

جلوہ نہیں ہے دردِ سر، آئنہ صندلی نہ کر
عکس کجا؟ و کو نظر؟ نقش کو مدّعا سمجھ

حیرت اگر خرام ہے، کارِ نگہ تمام ہے
گر کفِ دست بام ہے، آئنے کو ہوا سمجھ

ہے خطِ عجز ما و تو، اوّلِ درسِ آرزو
ہے یہ سیاقِ گفتگو، کچھ نہ سمجھ، فنا سمجھ

شیشہ شکستِ اعتبار، رنگ بگردشِ استوار
گر نہ ملیں یہ کوہسار، آپ کو تو صدا سمجھ

نغمہ ہے، محوِ ساز رہ، نشہ ہے، بے نیاز رہ
رندِ تمام ناز رہ، خلق کو پارسا سمجھ

چرخ بپہلوئے خیال، رزقِ دو عالم احتمال
کل ہے جو وعدۂ وصال، آج بھی، اے خدا، سمجھ

نے سرو برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق، تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ "یا علی مدد"
ٹوٹے گر آئنہ، اسد، سبحہ کو خوں بہا سمجھ

۱۸۲۱ء

دل ہی نہیں کہ منتِ درباں اٹھائیے
کس کو وفا کا سلسلہ جنباں اٹھائیے؟

تا چند داغ بیٹھیے، نقصاں اٹھائیے؟
اب چار سوئے عشق سے دوکاں اٹھائیے

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے م
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر، براتِ معاشِ جنونِ عشق م
یعنی، ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

دیوار، بارِ منتِ مزدور سے ہے خم م
اے خانماں خراب، نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے م
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

ہستی، فریب نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اٹھائیے

ضبطِ جنوں سے، ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز
یک نالہ بیٹھیے تو، نیستاں اٹھائیے

نذرِ خراشِ نالہ، سرِ شکِ نمک اثر
لطفِ کرم، بدولتِ مہماں اٹھائیے

انگور، سعیِ بے سر و پائی سے سبز ہے
غالب، بدوشِ دل خمِ مستاں اٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں، سخن، آزردہ لبوں سے م تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح، وجہِ پریشانیِ صہبا م یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد م زنہار، نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر م ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے
کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہائے عزیزاں؟ م خواری کو بھی اک عار ہے، عالی نسبوں سے
گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے، لیکن م جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے؟
مت پوچھ، اسدؔ، غصۂ کم فرصتیِ زیست م دو دن بھی جو کاٹے، تو قیامت تعبوں سے

● ۱۸۲۱ء

غمِ دنیا سے، گر پائی بھی، فرصت سر اٹھانے کی م فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب؟ م قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے م ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا م اٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا م ترا آنا نہ تھا، ظالم، مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی م مری طاقت کہ ضامن تھی، بتوں کے ناز اٹھانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں، غالبؔ م بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

● ۱۸۲۱ء

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی م
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے م
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟ م

مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں، وہ بھی

نہ کرتا کاش! نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم م
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں، وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ م
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی

مَے، عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟ م
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں، وہ بھی

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد، اے گردشِ گردونِ دوں، وہ بھی

نظر راحت پہ میری، کر نہ وعدہ شب کے آنے کا
کہ میری خواب بندی کے لیے ہوگا فسوں، وہ بھی

مرے دل میں ہے، غالب، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں م
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

● ۱۸۲۱ء

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے م
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر م
اب تک وہ جانتا ہے کہ، میرے ہی پاس ہے

کیا غم ہے اس کو، جس کا علی سا امام ہو
اتنا بھی، اے فلک زدہ، کیوں بے حواس ہے

کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک؟ م
ہر مُو، مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے

ہے وہ، غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا م
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پی، جس قدر ملے، شبِ مہتاب میں شراب م
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر یک مکاں کو ہے مکیں سے شرف، اسد م
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

۱۸۲۱ء

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے م خوش ہوں کہ، میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ ؟ م دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آئنہ پرداز؟ اے خدا م رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے! خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی م اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں، لباسِ کعبہ، علی کے قدم سے جان م نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق، تنگ تھا م دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسد م عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے
پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے، اسد دل وقفِ درد رکھ کہ فقیروں کا مال ہے

۱۸۲۱ء

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو م
حذر کرو مرے دل سے، کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا، یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے، کہ آخر م
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

۱۸۲۱ء

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے م اس سال کے حساب کو، برق، آفتاب ہے
مینائے مے ہے، سرو، نشاطِ بہار سے م بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے، پاشنہ پائے ثبات کا م نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے، شش جہت م غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا! م جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟ م مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا، اسدؔ، مسرّتِ پیغامِ یار سے م قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱۸۲۱ء

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی م دل، جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے م میں بھی، جلے ہووں میں، ہوں داغِ ناتمامی
کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی
صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی
طرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے، خدا نہ کردہ ہے نامہ بر کو اس سے دعوائے ہم کلامی
طاقت فسانۂ باد، اندیشہ شعلہ ایجاد اے غم، ہنوز آتش، اے دل ہنوز خامی!
ہر چند عمر گزری آزردگی میں، لیکن ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ، ناتمامی
ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

۱۸۲۱ء

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے م اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے م بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، مَیخانہ خالی ہے
زبانِ شوخ کا دل سخت ہوگا کس قدر، یارب! مری فریاد کو، کہسار، سازِ عجز نالی ہے
نشانِ بیقرارِ شوق، جز مژگاں، نہیں باقی کئی کانٹے ہیں، اور پیراہنِ نخلِ نہالی ہے
جنوں کر، اے چمن تحریر، درسِ شغلِ تنہائی نگاہِ شوق کو، صحرا بھی، دیوانِ غزالی ہے
یہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے زمیں، جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے
اسدؔ، مت رکھ تعجب خرد ماغی ہائے منعم کا کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

۱۸۲۱ء

وہ بات چاہتے ہوکر جو بات چاہیے ‏ ‏ صاحب کے ہمنشیں کو کرامات چاہیے
مسجد کے زیرِ سایہ، خرابات چاہیے ‏ م ‏ بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات، چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر ‏ م ‏ آخر، ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد، اے فلک دلِ حسرت پرست کی ‏ م ‏ ہاں، کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں، مہ رخوں کے لیے ہم مصوّری ‏ م ‏ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مَے سے غرض نشاط ہے، کس روسیاہ کو؟ ‏ م ‏ اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے
نشو و نما ہے اصل سے، غالبؔ، فروع کو ‏ م ‏ خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ‏ م ‏ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر، پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بےخودی ‏ م ‏ رُو، سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی، بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات ‏ م ‏ عارف، ہمیشہ مستِ مَے ذات چاہیے

۱۸۲۱ء

وحشت کہاں کہ بےخودی انشا کرے کوئی؟ ‏ ‏ ہستی کو لفظِ معنیِ عنقا کرے کوئی
جو کچھ ہے، محوِ شوخیِ ابروے یار ہے ‏ ‏ آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ، دیکھا کرے کوئی
عرضِ سرشک پر ہے، فضائے زمانہ تنگ ‏ ‏ صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی
خوانا نہیں ہے خطِ رقمِ اضطرار کا ‏ ‏ تدبیرِ پیچ تابِ نفس کیا کرے کوئی
تمثالِ جلوہ عرض کر، اے حسن، کب تلک ‏ ‏ آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی؟
وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے، اسدؔ ‏ ‏ دکھلا کے اس کو آئنہ توڑا کرے کوئی

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی ‏ م ‏ مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر م کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات م ہاں، درد بن کے دل میں، مگر، جا کرے کوئی
رونے سے، اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے م آخر، کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی م کیا فائدہ کہ جَیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے، رگِ ہر خار، شاخِ گل م تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز م تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست م نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر م فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی
ہے، وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز م یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل م جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی؟
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے، اسدؔ م پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

● ۱۸۲۱ء

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے، شعلہ پاسبانی م تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی م کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا م کہ "مرے عدو کو، یارب، ملے میری زندگانی"

● ۱۸۲۱ء

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے م طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنّت، حیاتِ دہر کے بدلے م نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو م ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر م خاک میں عشّاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی م غیرِ گل، آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو، بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے، غالبؔ!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۸۲۱ء

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہرا، کاغذ ترے خط کا، غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں!
ہم نہیں جلتے، نفَس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی، در ماندگی میں، نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے، زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی، مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر، سرنامے پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

۱۸۲۱ء

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
شوق، گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

مے پرستاں، خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

نفَسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالبؔ، اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

۱۸۲۱ء

زنجیر یاد پڑتی ہے، جادے کو دیکھ کر
اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے

سودائے خیال ہے، طوفانِ رنگ و بو
یاں ہے کہ داغِ لالہ، دماغِ بہار ہے
بھونچال میں گرا تھا یہ آئینہ طاق سے
حیرت، شہیدِ جنبشِ ابروے یار ہے
حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے

● ۱۸۲۱ء

پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی
ہم کو جلدی ہے، مگر تو نے قیامت ڈھیل کی
کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید؟
ہے جو آبی پیرہن، ہر موجِ رودِ نیل کی
عرش پر تیرے قدم سے ہے، دماغِ گردِ رہ
آج تنخواہِ شکستن ہے کُلَہ جبریل کی
مدعا در پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھ
وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
خیر خواہِ دیدہ ہوں، از بہرِ دفعِ چشمِ زخم
کھینچتا ہوں اپنی آنکھوں میں سلائی نیل کی
نالہ کھینچا ہے، سراپا داغِ جرأت ہوں، اسد
کیا سزا ہے میرے جرمِ آرزو تاویل کی؟

● ۱۸۲۱ء

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خراجِ دیہِ ویراں، یک کفِ خاک
بیاباں خوش ہوں تیری عاملی سے
پرَ افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم در بدر ناقابلی سے
اسد قربانِ لطفِ جورِ بیدل
خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

● ۱۸۲۱ء

ربطِ تمیزِ اعیاں، دُردِ مئے صدا ہے
اعمیٰ کو سرمۂ چشم، آوازِ آشنا ہے
موئے دماغِ وحشت، سر رشتۂ فنا ہے
شیرازۂ دو عالم، یک آہِ نارسا ہے

دیوانگی ہے، تجھ کو درسِ خرام دینا
موجِ بہار، یکسر زنجیرِ نقشِ پا ہے

پروانے سے ہو، شاید، تسکینِ شعلۂ شمع
آسایشِ وفاہا، بیتابیِ جفا ہے

اے اضطرابِ سرکش، یک سجدہ وار تمکیں
میں بھی ہوں شمعِ کشتہ، گر داغ خوں بہا ہے

نے حسرتِ تسلی، نے ذوقِ بے قراری
یک درد و صد دوا ہے، یک دست و صد دعا ہے

دریائے مے ہے ساقی، لیکن خمار باقی
تا کوچہ دادنِ موجِ خمیازہ آشنا ہے

وحشت نہ کھینچ، قاتل، حیرت نفس ہے بسمل
جب نالہ خوں ہو، غافل، تاثیر کیا بلا ہے

بت خانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

۱۸۲۱ء

گر یاس سر نہ کھینچے، تنگی عجب فضا ہے
وسعت گہِ تمنا، یک بام و صد ہوا ہے

برہم زنِ دو عالم، تکلیفِ یک صدا ہے
مینا شکستگاں کو کہسار خوں بہا ہے

فکرِ سخن یک انشا زندانیِ خموشی
دودِ چراغ، گویا، زنجیرِ بے صدا ہے

موزونیِ دو عالم، قربانِ سازِ یک درد
مصراعِ نالۂ نے، سکتہ ہزار جا ہے

درسِ خرام تا کے خمیازۂ روانی؟
اس موجِ مے کو، غافل، پیمانہ نقشِ پا ہے

گردش میں لا، تجلی، صد ساغرِ تسلی!
چشمِ تحیر آغوش، مخمورِ ہر ادا ہے

یک برگِ بینوائی، صد دعوتِ نیستاں
طوفانِ نالۂ دل، تا موجِ بوریا ہے

اے غنچۂ تمنا، یعنی کفِ نگاریں
دل دے، تو ہم بتادیں، مٹھی میں تیری کیا ہے

ہر نالہ اسدؔ ہے مضمونِ داد خواہی
یعنی، سخن کو کاغذ احرامِ مدعا ہے

۱۸۲۱ء

ذوقِ خود داری، خرابِ وحشتِ تسخیر ہے
آئنہ خانہ، مری تمثال کو زنجیر ہے

ذرہ دے، مجنوں لکے کس کس داغ کو پروازِ عرض؟
ہر بیاباں، یک بیاباں حسرتِ تعمیر ہے

مے کشِ مضموں کو حسنِ ربطِ خط کیا چاہیے؟
لغزشِ رفتارِ خامہ، مستیِ تحریر ہے

خانمانِ جبریانِ غافل از معنیِ خراب! — جب ہوئے ہم بے گنہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟
چاہیے گر جنت، جز آدم وارثِ آدم نہیں — شوخیِ ایمانِ زاہد، سستیِ تدبیر ہے
شب دراز و آتشِ دل تیز، یعنی، شکلِ شمع! — مہ، زِ سر تا ناخنِ پا، رزقِ یک شبگیر ہے
آب ہو جاتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل سے، مرد — اشک پیدا کر، اسدؔ، گر آہ بے تاثیر ہے

رباعیات

۱۸۲۱ء

دل، سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج
نیرنگِ زمانہ، فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفس میں، جوں طنابِ صنّاع
ہر پارۂ دل، بہ رنگِ دیگر ہے آج

۲

مشکل ہے، زبس، کلام میرا، اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی، کرتے ہیں فرمایش
”گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل“

۱۸۲۲ء

تا

۱۸۲۶ء

متفرق

نسخۂ شیرانی

۱۸۲۶ء

بعد از ۱۸۲۱ء

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا م عشقِ نبرد پیشہ، طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا م اڑنے سے پیشتر بھی، مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں م مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب م اس رہ گزر میں، جلوۂ گل، آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی م دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب، چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے م زنداں میں بھی، خیال، بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے م حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

بعد از ۱۸۲۱ء

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہائے راز کا م یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے م یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز! م میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں م طعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اچھل رہے م ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز م ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسد م سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

بعد از ۱۸۲۱ء

دوست، غمخواری میں میری، سعی فرماوینگے کیا؟ م زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاوینگے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور! کب تلک م ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماوینگے "کیا"؟

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ م کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاوینگے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں م عذر، میرے قتل کرنے میں وہ اب لاوینگے کیا!
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا، یوں سہی م یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جاوینگے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ م ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراوینگے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت، اسدؔ م ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہے، کھاوینگے کیا؟

● بعد از ۱۸۲۱ء

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا م درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد م تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں، تمام م مٹ گیا، گھسنے میں، اس عقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ، اللہ م اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ، مبدّل بدمِ سرد ہوا م باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال م ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھُلنا م روتے روتے غمِ فرقت میں، فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس م کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تا کہ تجھ پر کھُلے اعجازِ ہوائے صیقل م دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا غالبؔ م چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

● بعد از ۱۸۲۱ء

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب م دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا، موجِ شراب
پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن م سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا، موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے م سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما، موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر م موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا، موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے، طوفانِ طرب سے ہر سو! م موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز م دے ہے تسکیں، بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں، خوں ہو ہو کر م شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے، گزرگاہِ خیال م ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ م بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل م موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے! زہے! موسمِ گل م رہبرِ قطرہ بدریا ہے؛ خوشا! موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے، جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ م پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

بعد از ۱۸۲۱ء

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت م پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب م لکھے ہے: "خداوندِ نعمت سلامت!"

علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں م مبارک! مبارک! سلامت! سلامت!

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی م تماشائے نیرنگِ صورت سلامت!

دو عالم کی ہستی پہ خطِ فنا کھینچ م دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت!

نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ، گردوں م جگر خائیِ جوشِ حسرت سلامت!

نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی م سرِ خستہ و شورِ وحشت سلامت!

وفورِ وفا ہے، ہجومِ بلا ہے م سلامت ملامت، ملامت سلامت!

نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت م زِ خود رفتگی ہائے حیرت سلامت!

رہے غالبِ خستہ، مغلوبِ گردوں م یہ کیا بے نیازی ہے، حضرت سلامت؟

بعد از ۱۸۲۱ء

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل! م بلبل کے کاروبار پہ ہیں، خندہ ہائے گل

آزادیِ نسیمِ مبارک! کہ ہر طرف م ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں رہ گیا م اے وائے! نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا، کہ جو م رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گل، سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار م میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے م مینائے بے شراب، و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی م خوں ہے مری نگاہ میں، رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک م بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
دیوانگاں کا چارہ فروغِ بہار ہے ہے شاخِ گل میں، پنجۂ خوباں، بجائے گل
مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں؟ اے وائے! اگر نگاہ نہ ہو آشنائے گل
غالب! مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو م جس کا خیال، ہے گلِ جیبِ قبائے گل

بعد از ۱۸۲۱ء

دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا م بارے، اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد، یاں
ہیں زوال آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام م مہرِ گردوں، ہے چراغِ رہگزارِ باد، یاں

بعد از ۱۸۲۱ء

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟ ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟[1]
نہیں کرنے کا میں، تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں محرمِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟
شکر سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں؟
اپنے دل ہی سے، میں احوالِ گرفتاریِ دل جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں؟
دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

---

[1] یہ غزل دیوانِ نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی متوفی ۱۸۲۶ء کے ایک مخمس میں ملتی ہے۔

میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غمّاز — گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو، اسدؔ — حسبِ حال اپنے پھر اشعار، کہوں یا نہ کہوں؟

بعد از ۱۸۲۱ء

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دِکھا کہ یوں م بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں
پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا؟ کہ بن کہے م اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے م آوے وہ یاں، خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں
غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے م سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
بزم میں اُس کے روبرو، کیوں نہ خموش بیٹھیے؟ م اُسکی تو خامشی میں بھی، ہے یہی مُدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی" م سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح"؟ م دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟ م آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال م موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ "ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی"؟ م گفتۂ غالبؔ ایکبار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

بعد از ۱۸۲۱ء

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟ م وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟ م ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا م شورِ سودائے خطّ و خال کہاں؟
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے م اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟
ایسا آساں نہیں لہو رونا م دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق م واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں؟
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں م میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

فلکِ سفلہ بے محابا ہے م اس ستمگر کو انفعال کہاں؟
بوسے میں وہ مضایقہ نہ کرے م پر مجھے طاقتِ سوال کہاں؟
مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب م وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

● بعد از ۱۸۲۱ء

وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو م کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا م ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ م ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے "کہتے ہیں" ہر درد کی "دوا" م یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ م اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی، بجائے خود اک محشرِ خیال م ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال م حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں م اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی م عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں، اسدؔ م اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

● بعد از ۱۸۲۱ء

ہے سبزہ زار، ہر در و دیوارِ غمکدہ م جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے م دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

● بعد از ۱۸۲۱ء

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے م
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے م
آبگینہ، تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو، یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟ م
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے م
دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ، واہ! م
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے، طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق م
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سن کر، دلِ رنجور یاں م
مثلِ نقشِ مدعائے غیر، بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق، وہ پری رخ اور نازک بن گیا م
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اُس کے، مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں! م
کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا، مجھ سے، مثلِ دود بھاگے ہے، اسدؔ م
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

● بعد از ۱۸۲۱ء

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے م تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

بہ نسبیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم ٭ لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیٔ وحدت، ہے پرستاریٔ وہم ٭ کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا ٭ عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے
زندگی میں بھی، رہا ذوقِ فنا کا مارا ٭ نشہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے
بسکہ تھی فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن ٭ رنگِ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خور سے، فنا ہوتی ہے شبنم، غالبؔ ٭ کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

بعد از ۱۸۲۱ء

کبھی نیکی بھی، اُس کے جی میں، گر آجائے ہے مجھ سے ٭
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا، جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؟ ٭
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخو، اور میری داستانِ شوق طولانی ٭
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے ٭
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے، اے ناامیدی، کیا قیامت ہے ٭
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن ٭
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے؟
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نبردِ عشق میں، زخمی ٭
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر، غالبؔ ٭
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بعد از ۱۸۲۱ء

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر ؎ مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

بعد از ۱۸۲۱ء

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی ؎ میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے ؎ کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ ؎ اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ؎ غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو ؎ آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر، ہر چند کہ ہے برق خرام ؎ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ؎ نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف ؎ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے ؎ بے نیازی، تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ ؎ گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

بعد از ۱۸۲۱ء

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے ؎ جس میں کہ ایک بیضۂ مور، آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت، تیرے ذوق سے ؎ پرتو سے، آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے
حال آں کہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ ؎ غافل کو میرے شیشے پہ مَے کا گمان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا ؎ آوے نہ کیوں پسند، کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ ؎ بس چپ رہو، ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا!
کس سے کہوں کہ "داغ"، جگر کا نشان ہے

ہے بارے، اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب، ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

دلّی کے رہنے والو، اسد کو ستاؤ مت
بیچارہ، چند روز کا یاں میہمان ہے

بعد از ۱۸۲۱ء

درد سے میرے، ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی، ظالم، تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے!

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے!

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی، تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی، تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا!
دل پہ اک، لگنے نہ پایا، زخمِ کاری ہائے ہائے!

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟
ہے، نظر، خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے!

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب، ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتا، اسد
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

بعد از ۱۸۲۱ء

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

دل تو ہو اچھا نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسبابِ تمنا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ م بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل م کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی م منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو م کس قدر دشمن ہے؟ دیکھا چاہیے
اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی م یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید م نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے م چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ م آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

بعد از ۱۸۲۱ء

پھر کچھ اک، دل کو بے قراری ہے م سینہ، جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن م آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز م پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم، دلّالِ جنسِ رسوائی م دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی م وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر م محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ، پھر عرضِ ناز کرتا ہے م روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں م پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز م گرم، بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر م زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال م ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب م اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا م آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں، غالبؔ م کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بعد از ۱۸۲۱ء

وہ، آ کے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں، لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"

بعد از ۱۸۲۱ء

مدت ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع، پھر، جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے دل
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر، بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر، طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر، ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر، ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں، آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر، نگاہ م چہرہ، فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں م سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن م بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ، ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے م بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

۱۸۲۶ء

عشق، تاثیر سے نومید نہیں م جاں سپاری، شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے م جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلّی تری، سامانِ وجود م ذرّہ، بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے م ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈریے م غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں "جیتے ہیں امّید پہ لوگ" م ہم کو جینے کی بھی امّید نہیں

مےکشی کو نہ سمجھ بے حاصل م بادہ، غالبؔ، عرقِ بید نہیں

۱۸۲۶ء

ہو گئی ہے، غیر کی شیریں بیانی، کارگر م عشق کا، اُس کو گماں، ہم بے زبانوں پر نہیں

۱۸۲۶ء

دیوانگی سے، دوش پہ زنّار بھی نہیں م یعنی، ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے م دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے م دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے، اور یاں م طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش م صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف م یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان م آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی م حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا! م لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا م دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

● ۱۸۲۶ء

مزے جہان کے، اپنی نظر میں خاک نہیں م سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر، ہوا اڑا لے جائے م وگرنہ تاب و تواں، بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟ م کہ غیرِ جلوۂ گل، رہگزر میں خاک نہیں
بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا م اثر، مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش م شرابخانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ م سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسد م کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

● ۱۸۲۶ء

بے اعتدالیوں سے، سبک سب میں ہم ہوئے م جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا، دام، سخت قریب آشیانہ کے م اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے م یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر م وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں م تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں م ہر چند اُس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ رے! تیری تندیِ خو، جس کے بیم سے م اجزائے نالہ، دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق م جو پانو اُٹھ گئے، وہی اُن کے عَلَم ہوئے
نالے، عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے م جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے
چھوڑی، اسدؔ، نہ ہم نے گدائی میں دل لگی م سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

● ۱۸۲۶ء

عجب نشاط سے جلّاد کے، چلے ہیں ہم، آگے م
کہ اپنے سائے سے، سر، پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت م
فقط "خراب"، لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی م
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے! داد اس جنونِ شوق کی دینا م
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے، ہم، آگے

یہ عمر بھر، جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے م
تمھارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بخم آگے

دل و جگر میں پَر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے م
ہم، اپنے زعم میں، سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالب م
ہمیشہ کھاتے تھے، جو میری جان کی قسم آگے

۱۸۲۶ء

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو، یارب، اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

اے بے خبراں، میرے لبِ زخمِ جگر پر
بخیہ جسے کہتے ہو شکایت ہے رفو کی

گو زندگیِ زاہدِ بے چارہ عبث ہے
اتنا ہے کہ رہتی تو ہے تدبیر وضو کی

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے، غالب
حسرت میں رہے، ایک بتِ عربدہ جو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

۱۸۲۶ء

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ، پابندِ نے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو، تو دے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے، زاہد؟
مے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے

انجامِ شمارِ غم نہ پوچھو
یہ مصرفِ تا کے نہیں ہے

جس دل میں کہ "تا کے" سما جائے
واں عزتِ تختِ کے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالب
آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

۱۸۲۶ء

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی م وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

● ۱۸۲۶ء

رونے سے، اور عشق میں بے باک ہو گئے م دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ میکشی م تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے، آوارگی سے، تم م بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟ م پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟ م آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا، ہم گلہ م کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق م ہوں شمع، آپ اپنی وہ خوراک ہو گئے
اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش م دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

● ۱۸۲۶ء

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا م مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

● ۱۸۲۶ء

کب وہ سنتا ہے کہانی میری م اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ م دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟ م مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال م بھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا م رک گیا، دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں م سخت ارزاں ہے، گرانی میری

گردِ بادِ رہِ بیتابی ہوں م صرصرِ شوق، ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا م کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز، غالب م ننگِ پیری ہے، جوانی میری

۱۸۲۶ء

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے م کر گئی وابستۂ تن، میری عُریانی، مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں م مرحبا میں، کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہے م جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی م لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے! م اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا م لے گیا تھا گور میں، ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟ م تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ! م پھر ہوا ہے تازہ، سودائے غزلخوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی م میرزا یوسف ہے، غالب! یوسفِ ثانی مجھے

۱۸۲۷ء

تا

۱۸۲۸ء

نسخۂ شیرانی

(کلام مندرجہ حواشی)

بعد از ۱۸۲۶ء

گلِ رعنا

۱۸۲۸ء

● بعد از ۱۸۲۶ء

ستائش گر ہے زاہد، اس قدر جس باغِ رضواں کا م وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے، بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا؟ م کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو م لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے م مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے م کرے جو، پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے، اک صورت خرابی کی م ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر م مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں م چراغِ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے م دلِ افسردہ، گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ م سبب کیا خواب میں آ کر، تبسم ہائے پنہاں کا؟
نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا! م قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالب م کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

● بعد از ۱۸۲۶ء

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! م نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟ م کہاں تک، اے سراپا ناز "کیا، کیا"؟
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں م شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں م تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے م ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے م تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا؟
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے م غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟

سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا، سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ "انا البحر"
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟

محابا کیا ہے؟ میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

کیا اُس نے جگر داری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟

• یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ، کافر، فتنۂ طاقت رُبا کیا؟

بلائے جاں ہے، غالبؔ، اُسکی ہر بات
عبارت کیا، اِشارت کیا، ادا کیا؟

• بعد از ۱۸۲۶ء

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں!
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے، اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے، اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے
پنبہ، نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے، عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، اگر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں، ہم، اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ، اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی، ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موجِ مے کی، آج، رگ، مینا کی گردن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا، غالبؔ، کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف، ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

• بعد از ۱۸۲۶ء

ذکر میرا، بہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا! طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدّر ہے، جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن م ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت، اے ذوقِ خرابی، کہ وہ طاقت نہ رہی م عشقِ پُر عربدہ کی گوں، تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں" م کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو م تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
پیٹھ محراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے محوِ نسبت ہیں، تکلف ہمیں منظور نہیں
صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں، ہم لوگ م وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی، غالب م میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

● بعد از ۱۸۲۶ء

نالہ، جز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد نہیں م ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب! م ہم کو تسلیم، نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم م دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے، طوفانِ حوادث، مکتب م لطمۂ موج، کم از سیلیِ استاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم، و بدا! حالِ وفا م جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ م گر چراغانِ سرِ رہگزرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں م مژدہ، اے مرغ، کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے، اثبات، تراوش، گویا م دی ہے جائے دہن، اس کو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت م یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت، غالب م تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

● بعد از ۱۸۲۶ء

واں پہنچ کر، جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو م صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے م کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن
ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اڑانے کے، جو، وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالب
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

بعد از ۱۸۲۶ء

ظلمت کدے میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

ہو کر شہیدِ عشق میں، پائے ہزار جسم
ہر موجِ گردِ راہ، مرے سر کو دوش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق، ہاں، اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار، بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی، و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں — نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں — غالبؔ، صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

۱۸۲۸ء

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے — بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت، کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے، و لے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس، ہجومِ ناامیدی، خاک میں مل جائے گی — یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنج رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے! — اٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی — فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء

مُتَفرّق

نسخۂ رام پور

(اوّل / قدیم)

۱۸۳۳ء

۱۸۲۸ء

قطعہ

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک [1]

ہم سخن و ہم زباں، حضرتِ قاسم و طباں
ایک طپش کا جانشیں، دردؔ کا یادگار ایک

نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک

گُل کدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بُو
ریختے کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک

مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
میکدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
ایک محبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک

جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے، کہہ کے یہ غزل، شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زباں کو، غالبِ خاکسار، ایک

قطعہ

م

۱۸۲۹ء

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اُسے جس قدر اچھا کہیے [2]

خامہ، انگشت بدنداں، کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ، سر بہ گریباں، کہ اسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مِسی آلودہ سرانگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

---

(۱) یہ غزل قیامِ کلکتہ کے زمانے (فروری ۱۸۲۸ء تا ستمبر ۱۸۲۹ء) میں لکھی گئی تھی۔

(۲) یہ قطعہ بھی قیامِ کلکتہ کے زمانے میں کہا گیا تھا۔ (اس غزل اور قطعے کا سالِ فکر محض قیاسی ہے۔ دونوں کلام ایک ہی سال یعنی ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء کے فکر کردہ ہو سکتے ہیں)۔

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے

حجرُ الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں، سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں، اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں، اُسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے؟
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے؟
کیوں اسے نقشِ پےِ ناقۂ سلمیٰ کہیے؟

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سُوَیدا کہیے!

● ۱۸۳۳ء قطعہ

م

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں (۱)
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب!
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے! ہائے!

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر!
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے! ہائے!

وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ!
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے! ہائے!

غزلیات

● ۱۸۳۳ء

مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، غالبؔ م یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت!

● ۱۸۳۳ء

لو، ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں م اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

---

(۱) یہ قطعہ کلکتہ سے واپسی کے بعد کہا گیا معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۳۳ء

کیوں جل گیا نہ، تابِ رخِ یار دیکھ کر ؟ م جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے م سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا ؟ م رُکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے م مرتا ہوں، اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق م لرزے ہے موجِ مے، تری رفتار دیکھ کر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ م ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ م لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زُنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال م رہرو چلے ہیں، راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں م جی خوش ہوا ہے، راہ کو پُر خار دیکھ کر
کیا بد گماں ہے مجھ سے، کہ آئینے میں مرے م طوطی کا عکس سمجھے ہے، زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر م دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا م یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

۱۸۳۳ء

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دُور م رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں، اے خدا م رکھ لیجو، میرے دعویِٰ وارستگی کی شرم

۱۸۳۳ء

اس قدر ضبط کہاں ہے کبھی آ بھی نہ سکوں — ستم اتنا تو نہ کیجے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
لگ گئی آگ اگر گھر کو، تو اندیشہ کیا — شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤ گے، تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں
ہنس کے بلوائیے، مٹ جائے گا سب دل کا گلہ — کیا تصور ہے تمہارا کہ مٹا بھی نہ سکوں

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت م میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟ م بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر، ورنہ م کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

● ۶۱۸۳۳

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں م کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے م کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو م یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کُلَہ کو کیا دیکھیں ؟ م ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

● ۶۱۸۳۳

واں اُس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار م یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ م آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

● ۶۱۸۳۳

رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو م ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے م کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار م اور اگر مر جائیے، تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

● ۶۱۸۳۳

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا م
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

۱۸۳۳ء

پینَس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے، وہ، میرے م
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

۱۸۳۳ء

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ، غالب م
ہم بیاباں میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے!

۱۸۳۳ء

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی م دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا! لذّتِ فراغ م تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؛ م اٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے، خاک مری، کوئے یار میں م بارے اب، اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو، دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا م موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی م اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نَظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا م مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا م کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
مارا زمانے نے، اسداللہ خاں، تمھیں م وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

۱۸۳۳ء

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے م جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایے کی طرح ساتھ پھریں، سرو و صنوبر — تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے — جب لختِ جگر، دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت، کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا، اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک — آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو، گر، ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ نالاں — جب اک نفَس اُلجھا ہوا ہر خار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے — اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے — جو لفظ کہ، غالب، مرے اشعار میں آوے

رباعیات

● ۱۸۳۳ء

۱

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال — ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی — لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

● ۱۸۳۳ء

۲

دل، سخت نژند ہو گیا ہے، گویا — اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے، گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں — غالب، منہ بند ہو گیا ہے، گویا

● ۶۱۸۳۳

دکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے، غالبؔ — م — دل، رُک رُک کر، بند ہو گیا ہے، غالبؔ
واللہ، کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں! — سونا، سوگند ہو گیا ہے، غالبؔ

●

۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء

مُتفرّق

اِنتخابِ غالب	۱۸۳۶ء
نسخۂ بدایونی	۱۸۳۸ء
پہلا مطبوعہ ایڈیشن	۱۸۴۱ء
نسخۂ دلیسنہ	۱۸۴۵ء
نسخۂ کریم الدین (کراچی)	۱۸۴۵ء
دوسرا مطبوعہ ایڈیشن	۱۸۴۷ء

غزلیات

۱۸۳۵ء

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے — فقط اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا — آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اُٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالبؔ م ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

۱۸۳۸ء

دھوتا ہوں جب میں، پینے کو، اُس سیم تن کے پانو م رکھتا ہے، ضد سے کھینچ کے، باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو م ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ م ہو کر اسیر، دابتے ہیں راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور م تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانو
اللہ رے! ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ م ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے پانو
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف م اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو
بیچارہ کتنی دور سے آیا ہے، شیخ جی م کعبے میں، کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں! م دُکھتے ہیں، آج، اُس بتِ نازک بدن کے پانو
غالبؔ، مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟ م پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

قطعہ

بعد از ۱۸۳۸ء

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی! جانے دو، مل جاؤ م قسم لو ہم سے، اگر یہ بھی کہیں: "کیوں ہم نہ کہتے تھے؟"

---

(۱) گلشنِ بے خار مولفہ آخر سنہ ۱۲۵۰ھ (اپریل ۱۸۳۵ء) میں صرف یہی شعر (مقطع) پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اوپر کے دو شعر بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔

غزلیات

● بعد از ۱۸۳۸ء

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا م سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ، ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو م وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

● بعد از ۱۸۳۸ء

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے م مرتے ہیں، مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی م ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے م غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

● بعد از ۱۸۳۸ء

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے م
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے، جو اُس کو دیکھ کر آجائے رحم؟ م
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب م
کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں م
زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

رباعیات

بعد از ۱۸۳۸ء

(۱)

بھیجی ہے جو، مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال   ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال   ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

۱۸۴۱ء

(۲)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم   آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم   ہے اب کے شبِ قدر و دِوالی باہم

قطعہ

۱۸۴۷ء

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے   مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر   جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

غزلیات

۱۸۴۷ء

نوید امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لیے   رہی نہ، طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے   رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر   نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی، میں مبتلائے آفتِ رشک   بلائے جاں ہے، ادا تیری، اک جہاں کے لیے
فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے، کہ میں ہی نہیں   درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر ؎ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے ؎ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم، میں نے پاسباں کے لیے
بہ قدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل ؎ کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے ؎ بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا، یہ کس کا نام آیا؟ ؎ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں، اور معینِ ملّت و ملک ؎ بنا ہے چرخِ بریں، جس کے آستاں کے لیے
زمانہ، عہد میں اُس کے، ہے محوِ آرایش ؎ بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے ؎ سفینہ چاہیے، اس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے، غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا ؎ صلائے عام ہے، یارانِ نکتہ داں کے لیے

● ۱۸۴۷ء

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں ؎ کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں[۱]

● ۱۸۴۷ء

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ؎ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے ؎ کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو ؎ جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے ؎ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود ؎ قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ، جب سے، تجھے رحم آیا ہے ؎ خارِ رہ کو ترے، ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
اِک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا؟ ؎ آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

۱۔ یہ شعر عہدِ اسیری کی یادگار ہے۔ دیکھیے کلامِ گھنشیام لال عاصی مطبوعہ ۱۹۳۹ء اور آبِ حیات از آزاد

دیکھیے، لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ م اُس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید م "مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

● ۱۸۴۷ء

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں م اک چھیڑ ہے، وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اِس لطفِ خاص کا؟ م پرسش ہے، اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز م نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی م آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے م ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں، مطربِ ترانۂ "ھَل مِن مَّزِید" ہے م لب، پردہ سنجِ زمزمۂ "الاماں" نہیں
خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم م دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو م ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب م سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟" م گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی م روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ، وے کیوں کہے ابھی؟ م غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

● ۱۸۴۷ء

ملتی ہے خوئے یار سے، نار، اِلتہاب میں م کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں؟ م شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ، انتظار میں، نیند آئے عمر بھر م آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں م میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ م ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے؟ م کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں، وصل میں خوفِ رقیب سے م ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے م جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے م ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ، ایک چُرانا نگاہ کا م لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ، دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے! م جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر، مدّعا طلبی میں نہ کام آئے! م جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالب چھُٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی م پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہ تاب میں

۱۸۴۷ء

کل کے لیے، کر آج نہ خسّت شراب میں م یہ سُوءِ ظن ہے، ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند م گستاخیِ فرشتہ، ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ م گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں، دیکھیے، تھمے م نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے م جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے م حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر م یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی م ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز م پیشِ نظر ہے آئنہ، دائم، نقاب میں
ہے غیب غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود م ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
غالب، ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست م مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء

متفرق

نسخۂ لاہور
۱۸۵۲ء

قطعہ
۴

بعد از ۱۸۴۷ء

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت، اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت، اکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے، عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے، دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

ق

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

ق

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے، بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

درِ معنی سے، مرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے، مرا سینہ، عمر کی زنبیل

فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل

نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

غزلیات

بعد[عہ] از ۱۸۴۷ء

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں! م گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا!
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں م وہ دن گئے کہ اپنا، دل سے، جگر جدا تھا
درماندگی میں، غالب، کچھ بن پڑے، تو جانوں م جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

بعد از ۱۸۴۷ء

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو، ویراں ہوتا م بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے م کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمرِ وَرَع، بار تو دیتا، بارے م کاش! رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا!

بعد از ۱۸۴۷ء

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا م آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلہ م اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں م کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟
قید میں ہے ترے وحشی کو، وہی زلف کی یاد م ہاں، کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

عہ عرشی صاحب (دیوانِ غالب طبع دوم مرتبہ عرشی ص ۱۳۲) لکھتے ہیں کہ غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن' مملوکہ رضا لائبریری رامپور' کے آخری سادہ اوراق پر میرزا صاحب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اس دیوان کی اشاعت کے بعد کہا تھا" اتفاق سے میرے غالب کلکشن میں بھی غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دوسرے ایڈیشن کا نسخہ موجود ہے اور اسکے آخر میں بھی تقریباً وہ تمام کلام کسی نامعلوم شخص کے قلم سے درج ہے جسکی نشاندہی عرشی صاحب نے کی ہے۔ مگر میرے نسخے میں کچھ کلام زائد ہے جسے میں نے اسے بھی شامل کرلیا ہے۔ ایسے کلام کو ۱۸۴۷ء کے بعد چند ہی سالوں کے دوران میں کہا ہوا کہنا چاہیئے۔ اس نسخے میں جو کلام 'بعد از ۱۸۴۷ء' کے عنوان سے درج ہے وہ یہی کلام ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟ م بات کرتے، کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی م گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ، کلیجا ٹھنڈا؟ م نالہ کرتا تھا، وے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام م ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی م آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق م آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو، غالب م کہتے ہیں "اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا"

بعد از ۱۸۴۷ء

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا م بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب م آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے م عرش سے اِدھر ہوتا، کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے م بارے، آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں، اُن کو دکھلاؤں م انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا م ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو م دوست کی شکایت میں، ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟ م بے سبب ہوا غالب، دشمن آسماں اپنا

بعد از ۱۸۴۷ء

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا م اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا م کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا م کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو م یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟ م کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا م جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے م غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بری بلا ہے م مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا م نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا م جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالب! م تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

بعد از ۱۸۴۷ء

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا م ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا؟
ہوا جب غم سے یوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟ م نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے م وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا، تو کیا ہوتا"

بعد از ۱۸۴۷ء

گھر جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر م جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر؟
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن م جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر، کہے بغیر؟
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہاں میں م لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم م سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑونگا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا م چھوڑے نہ خلق، گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام م چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو م بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات م سنتا نہیں ہوں بات، مکرّر کہے بغیر
غالب، نہ کر حضور میں تو بار بار عرض م ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر، کہے بغیر

بعد از ۱۸۴۷ء

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو م مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے م قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں؟ م مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے، ایک تار م مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید م مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست م لیکن، خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں م دنیا ہو، یارب، اور مرا بادشاہ ہو

بعد از ۱۸۴۷ء

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے م حورانِ خلد میں تری صورت، مگر، ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل م میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم م ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن، اے ندیم م میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا م فرصت، کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں م جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار، دیکھنا م تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

بعد از ۱۸۴۷ء

کوئی دن گر زندگانی اور ہے م اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں! م سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں م پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر م کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں، اکثر نجوم م وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں، غالبؔ، بلائیں سب تمام م ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

بعد از ۱۸۴۷ء

کوئی اُمید بر نہیں آتی م کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے م نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی، حالِ دل، پہ ہنسی م اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد م پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات، جو چپ ہوں م ورنہ، کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں م میری آواز، گر، نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا م بُو بھی، اے چارہ گر، نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی م کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی م موت آتی ہے، پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے، غالبؔ؟ م شرم تم کو مگر نہیں آتی

بعد از ۱۸۴۷ء

دلِ ناداں، تجھے ہوا کیا ہے؟ م آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار م یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں م کاش! پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں، کوئی موجود م پھر یہ ہنگامہ، اے خدا، کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ م غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ م نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ॥ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید ॥ جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
"ہاں، بھلا کر، ترا بھلا ہوگا!" ॥ اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں ॥ میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ॥ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

بعد از ۱۸۴۷ء

حُسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے ॥ اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ॥ جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"
اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا ॥ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے ॥ وہ گدا، جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر ॥ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض! ॥ اک برہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا ॥ جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے!
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے ॥ کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز ॥ شاہ کے باغ میں، یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن ॥ دل کے خوش رکھنے کو، غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

بعد از ۱۸۴۷ء

شکوے کے نام سے، بے مہر، خفا ہوتا ہے ॥
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گِلہ ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا ॥
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو م
شکوۂ جور سے، سر گرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال م
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم م
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ م
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب م
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربُدِ بزمِ سخن م
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہِ مہرِ عَلَم م
تیرے اِکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اِقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے م
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال م
آستاں پر ترے، مہ، ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں، آئینِ غزل خوانی میں م
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب، مجھے اس تلخ نوائی میں مُعاف م
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بعد از ۱۸۴۷ء

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" م تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا م کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟
مزہ تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا، ہم سے وہ خود کہے کہ "بتا تیری آرزو کیا ہے؟"
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے م وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے، پیراہن م ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا م کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل م جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز م سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو کیا ہے؟
پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار م یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی م تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا م وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

بعد از ۱۸۴۷ء

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی م میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی م ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟
چال جیسے کڑی کمان کا تیر م دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے م وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ م کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی
نہ سنو، گر برا کہے کوئی م نہ کہو، گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی م بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟ م کس کی حاجت روا کرے کوئی؟
کیا کیا خضر نے سکندر سے! م اب کسے رہنما کرے کوئی؟

جب توقع ہی اُٹھ گئی، غالبؔ   کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی؟

بعد از ۱۸۴۷ء

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے   بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے!
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا   میں، اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے!
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مے   مُدّت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہوا کیے!
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر   حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے!"
مقدور ہو، تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم   تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے؟"
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟   کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے!
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے!
ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں   بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے!
غالبؔ، تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟   مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے!

بعد از ۱۸۴۷ء

میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں!   چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو   کاشکے! تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم اگر اتنا تھا   دل بھی یا رب، کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ   کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

قطعہ

۱۸۴۹ء

مژدہ! اے رہروانِ راہِ سخن   پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن ۱

۱۔ منظوم اشتہار (اسعد الاخبار آگرہ ۔ ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء) ۔ یہ اشتہار غالبؔ کے شاگرد غلام نجف خاں کے نام سے چھپا تھا۔

طے کرد راہِ شوق زودا زود
آن پہنچی ہے منزلِ مقصود!

پاس ہے اب، سوادِ اعظمِ نثر
دیکھیے، چل کے، نظمِ عالمِ نثر

سب کو اُس کا سواد ارزانی!
چشمِ بینش ہو جس سے نورانی

یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا
جلوۂ مدّعا نظر آیا

ہاں، یہی شاہراہِ دہلی ہے
مطبعِ بادشاہِ دہلی ہے

منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ
گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار
بارور جس کا سرو، گل بے خار

نہیں اس کا جواب، عالم میں
نہیں ایسی کتاب، عالم میں

اس سے اندازِ شوکتِ تحریر
اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر

مرحبا طرزِ نغز گفتاری
حبّذا رسم و راہِ نثاری

نثرِ مدحت سرائے ابراہیم
ہے مقرر جو، اب، پئے تعلیم

اُس کے فقروں میں کون آتا ہے؟
کیا کہیں، کیا وہ راگ گاتا ہے

تین نثروں سے کام کیا نکلے؟
اُن کے پڑھنے سے نام کیا نکلے؟

ورزشِ قصۂ حسن کب تک؟
داستانِ شہِ دکن کب تک؟

تا کجا درسِ نثر ہائے حسن؟
تازہ کرتا ہے دل کو، تازہ سخن

تھے ظہوری و عرفی و طالب
اپنے اپنے زمانے میں غالب

نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے
اسد اللہ خانِ غالب ہے

قول حافظ کا ہے بجا، اے دوست
"ہر کرا پنج روز نوبتِ اوست"

کل وہ سرگرمِ خود نمائی تھے
شمعِ بزمِ سخن سرائی تھے

آج یہ قدر دانِ معنی ہے
بادشاہِ جہانِ معنی ہے

نثر اس کی، ہے کارنامۂ راز
نظم اس کی، نگارنامۂ راز

دیکھو اس دفترِ معانی کو
سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو

اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا
سینہ گنجینۂ گہر ہوگا

ہو سخن کی جسے طلب گاری
کرے اس نسخے کی خریداری

آج جو دیدہ ور کرے درخواست
تین بھیجے، ٹکے، وہ بے کم و کاست

منطبع جبکہ ہو چکے گی کتاب — زرِ قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے، پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم، نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہارِ ریاضِ مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
ہیں جو ہوں درپئے حصولِ شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ، القصّہ، حاصلِ تحریر — کہ نہ ارسالِ زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے — ابتدائے ورق شماری ہے

غزلیات

● ۱۸۴۹ء

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — م — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — م — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — م — اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے، میری بلا ڈرے — م — کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے" — م — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ — م — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — م — کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — م — جاتا، وگرنہ، ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — م — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں
غالب، خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز — م — دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں[1]

● ۱۸۵۰ء

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں — م — خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

۱؎ نواب علی بہادر، والیِ باندہ، اگست ۱۸۴۹ء میں حاکم باندہ ہوئے۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟ م انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب، زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟ م لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے م آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟ م لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں؟
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟ م رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟ م کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا م وہ دن گئے جو کہتے تھے[۱] نوکر نہیں ہوں میں[۲]

رباعیات

۱۸۵۰ء

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو، ماوراء النہری؟

۱۸۵۰ء

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں
سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبیؐ نے اُن کو اپنا ہمدم
ہے ہے، نہ کہو، کسے بُرا کہتے ہیں

۱۸۵۰ء

یارانِ رسول، یعنی اصحابِ کبار
ہیں گرچہ بہت، خلیفہ اُن میں ہیں چار

---

۱ غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کے باقاعدہ ملازم ہوئے تھے۔

۲ یہ پانچوں رباعیاں سید الاخبار دہلی، جلد ۸ شمارہ ۲۸ - ۱۶ نومبر ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔

ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار غالب، وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

● ۱۸۵۰ء

یارانِ نبیؐ میں تھی لڑائی کس میں؟ الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں؟

وہ صدق، وہ عدل، وہ حیا (اور) وہ علم بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں؟

● ۱۸۵۰ء

یارانِ نبیؐ سے رکھ تولّا، باللہ! ہر ایک ہے کمالِ دین میں یکتا باللہ!

وہ دوست نبی کے اور تم ان کے دشمن لا حول و لا قوۃ الا باللہ!

غزلیات

● ۱۸۵۱ء

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو، نور کی م قسمت کھلی، ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں م پڑتی ہے آنکھ، تیرے شہیدوں پہ، حور کی

واعظ، نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو م کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اٹھا؟ م گویا، ابھی سنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج م اڑتی سی اک خبر ہے، زبانی طیور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں م کعبے سے، اُن بتوں کو بھی، نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟ م آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر م کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

غالب، اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں م حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی[۱]

۱۔ "دسمبر ۱۸۵۱ء میں ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی تھی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے، اور حج کے لیے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ غالباً اسی موقع پر غالب نے یہ غزل لکھی تھی" آثارِ غالب از شیخ محمد اکرم ص ۹۹

۱۸۵۱ء

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے | یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وو آئے" ۱؎
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں، جذبِ محبت | کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم | آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین | ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے | ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت؟ | دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں | اُس در پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں، تقریر | اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب! | ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے

قصیدہ

۱۸۵۲ء

ہاں، مہِ نو، سنیں ہم اس کا نام | جس کو تو جھک کے، کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح | یہی انداز اور یہی اندام
بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟ | بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام
اڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا | آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا! اے سرورِ خاصِ خواص | حبّذا! اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں، تین دن نہ آنے کے | لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا | صبح جو جاوے اور آوے شام

۱؎ نادراتِ غالب ص ۱۲ اور دہلی اردو اخبار، جلد ۱۳ نمبر ۱۹، ص ۴، مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۵۱ء

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا، مگر نہیں ہے، غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

مجھ کو کیا پایہ روشناسی کا!
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو اِنعام؟

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

ق

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا، اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟
غم سے جب ہو گئی ہو، زیست، حرام

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں اِحرام

اُس قدح کا ہے، دَور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے اِنکار
دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام

چھیڑتا ہوں کہ، اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں، ورنہ، غالبؔ اپنا نام؟

کر چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!

کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زُہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ
مَظہرِ ذُوالجلالِ وَالاِکرام

شہ سوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اِعجاز
جس کا ہر قول، معنیِ اِلہام

بزم میں، میزبانِ قیصر و جم
رزم میں، اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا!
اے ترا عہد فرّخی فرجام

چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ
لَوحشَ اللہ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے، قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے، مُرشدِ جام

وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے
اِیرج و تُور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام

مَرحبا! مُوشگافیِ ناوک
ق آفریں! آب داریِ صمصام

تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف
تیغ کو تیری، تیغِ خصم، نیام

رعد کا، کر رہی ہے کیا، دم بند!
ق برق کو دے رہا ہے کیا اِلزام!

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام

فنِّ صورت گری میں، تیرا گرز
ق گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

اُس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ اِدغام؟

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیَالی و ایّام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مُجملاً مُندرج ہوئے اَحکام

لکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کُش"
لکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں:
"گنبدِ تیز گردِ نیلی فام"

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں:
خال کو "دانہ" اور زلف کو "دام"

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نَم و رَم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام "خسروِ روز"
ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور، صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

۱۸۵۲ء

صبحدم، دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے، آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو، رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پہ پڑا تھا، رات کو — موتیوں کا، ہر طرف، زیور کھلا
صبح آیا، جانبِ مشرق، نظر — اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے، ساقی نے صبوحی کے لیے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زریں، مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے — رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے، نام — اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے، چہرۂ قیصر کھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — ق تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے، بت خانۂ آزر کھلا
مجھ پہ، فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے، لیکن ہر ایک — میری حدِّ وسع سے باہر کھلا
تھا، دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید — کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟
باغِ معنی کی، دکھاؤں گا بہار — مجھ سے، گر، شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانیِ نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں، یوں پر کھلا
کاش کے! ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے؟
یار کا دروازہ پاویں، گر، کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا، ہے، راز دشمن پر کھلا

واقعی، دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی، کب ابرو نے، کماں؟
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا، کس کو بُرا ہے، بَدرقہ
رہبری میں، پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟
آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا، خط میری چھاتی پر، کھلا

دیکھیو، غالب سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر، ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر، مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے سے پائی، طبیعت نے، مدد
بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا

مدح سے، ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں، عَرَض سے، رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب، عُلُوِّ پایۂ منبر کھلا!

سکّۂ شہ کا، ہوا ہے، روشناس
اب، عیارِ آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ
اب، مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا، خلق نے
اب، فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح؟ ہاں، اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی، پر ستایش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا

جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ، اے خاقانِ نام آور، کھلا

تم کرو صاحب قرانی، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا!

سہرا

۱۸۵۲ء

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور، سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا

ناؤ بھر کر ہی، پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ، کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اِس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو، گرمی سے، پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر، سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے، پھولوں کا بھی ایک، مقرر، سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ، خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا!

رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا!

تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانبارئ گوہر، سہرا!

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

قطعہ

م

۱۸۵۲ء

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سَو پشت سے، ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری، ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں؟
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے، پَرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر / سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدّعا / جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زِ رہِ امتثالِ امر / دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات / مقصود اُس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو، تو روسیاہ / سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی، پہ طبیعت بری نہیں / ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالبؔ، خدا گواہ! / کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے [1]

سہرا

۱۸۵۲ء

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا! / چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا [2]
جسے کہتے ہیں خوشی، اُس نے بلائیں لے کر / کبھی چوما، کبھی آنکھوں سے لگایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں، آپس میں اُلجھ کر لڑیاں / باندھنے کو جو ترے سر پہ اُٹھایا سہرا
صاف آتی ہیں نظر آبِ گہر کی لہریں / جنبشِ بادِ سحر نے جو ہلایا سہرا

---

[1] جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے یہ قطعہ (معذرت نامہ) شہزادہ جواں بخت کے سہرے کے مقطع کی وضاحت میں کہا گیا تھا، اس لیے اِسے سہرے کے فوراً بعد درج کیا گیا ہے۔

[2] یہ اس سہرے کے اشعار ہیں جو میاں غلام نظام الدین ابنِ میاں غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے۔ روایت کے مطابق یہ سہرا شہزادہ جواں بخت (فروری۔ مارچ ۱۸۵۲ء) کے سہرے کے بعد کہا گیا ہے۔ کیونکہ راوی کا کہنا ہے کہ یہ اول الذکر سہرے سے بہتر ہے۔ تفصیل کے لیے ناصر نذیر فراق کی 'لال قلعہ کی ایک جھلک' ص ۳۰، 'رسوم دہلی' ص ۱۰۷، (طبع کراچی) از سیّد احمد دہلوی ملاحظہ کیجیے۔

غزلیات

۱۸۵۲ء

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا م رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا م اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟ م آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں، گو نہ پاؤں اس کا بھید م پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال م خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں م زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا! م جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول م آج اُدھر ہی کو رہے گا، دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال م نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟ م واسطے جس شہ کے، غالب، گنبدِ بے در کھلا

۱۸۵۲ء

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور م کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات م دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا، اس نگہِ ناز کو، پیوند؟ م ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے م لے آئیں گے بازار سے، جا کر، دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں م ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا م ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اُس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے م جلاد کو لیکن، وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا م ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل، تمھیں دیتا، کوئی دم چین م کرتا جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے م رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے م کہتے ہیں کہ "غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"

۱۸۵۲ء

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور م تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا م ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں؟" م مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو: "قیامت کو ملیں گے" م کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں، اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف م کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے، مرے گھر کے م پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے؟ م کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی م بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال، یہ مدت خوش و ناخوش م کرنا تھا، جواں مرگ، گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالب؟" م قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

۱۸۵۲ء

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا م یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے م تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہلِ بزم؟ م ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں

۱۸۵۲ء

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں م خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی، رنگارنگ بزم آرائیاں م لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بناتُ النعشِ گردوں دن کے پردے میں نہاں م شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں؟
قید میں یعقوب نے لی، گو، نہ یوسف کی خبر م لیکن، آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے م ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق م میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام م قدرتِ حق سے، یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں م تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا م بلبلیں، سن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں، یارب، دل کے پار؟ م جو، مری کوتاہیِ قسمت سے، مژگاں ہو گئیں
بسکہ روکا میں نے، اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے م میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں
واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب م یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں
جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا م سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگِ جاں ہو گئیں
ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم م ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج م مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں م دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۱۸۵۲ء

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آزمائش ہے م
چمن میں، خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے م
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں، آخر م
ابھی اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!؟ م
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے م
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر م
غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُبحہ و زُنّار کے پھندے میں، گیرائی م
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل م
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو م
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالبؔ م
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

۱۸۵۲ء

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام، بہت ہے م یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ م ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام، بہت ہے
نَے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں م گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں؟ کہ نہ ہو گرچہ ریائی م پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟ م پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟ م آلودہ بہ مے جامۂ احرام، بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو م انکار نہیں، اور مجھے اِبرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ م رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے؟ م شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

رباعیات

● ۱۸۵۲ء

۱

حق شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے   تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں، گانٹھ   ہے صِفر کہ افزائشِ اعداد کرے

۲

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا!   اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں   ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!

●

۱۸۵۳ء تا فروری ۱۸۵۷ء

متفرق

نسخۂ رام پور (ثانی / جدید) ۱۸۵۵ء

قادر نامہ (طبع اوّل) ۱۸۵۶ء

متفرق

قطعہ

۱۸۵۳ء م

عہ

اے شاہِ جہانگیر، جہاں بخش، جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ ہو وا
تو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے، کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں، جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی، ترا، فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں ق
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے، موجۂ دریا میں، روانی
باقی نہ رہے، آتشِ سوزاں میں، حرارت

ہے، گرچہ، مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے، گرچہ، مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟
قاصر ہے، ستائش میں تری، میری عبارت

نو روز ہے آج، اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق، اہلِ بصارت

تجھ کو، شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک!
غالب کو، ترے عتبۂ عالی کی زیارت!

عہ" یہ قطعہ نوروز کی مبارکباد پر مشتمل ہے، اور نوروز، آفتاب کے برجِ حمل میں داخلے پر منایا جاتا ہے۔ میرزا صاحب سرور کو لکھتے ہیں: "تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں سچی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۲۱ کبھی ۲۳ بھی آپڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں۔" (عود: ۴۲) دہلی اردو اخبار جلد ۱۵ نمبر ۱۳ مورخہ جمادی الآخرہ ۱۲۶۹ھ مطابق ۲۷ مارچ ۱۸۵۳ء میں حضورِ والا کی نیازِ معمولیِ دسترخوان کا ذکر ہے، جو یک شنبہ ۹ جمادی الآخرہ کو نوروز کے دن منائی گئی تھی۔ یہ واقعہ میرزا سلیمان شکوہ بہادر کے پوتے میرزا نورالدین شاہی تخلص کی آمدِ دہلی کے بعد کا ہے۔ جن کی صحبت نے بہادر شاہ کو متہم بہ تشیع کیا تھا۔ اس لیے میری دانست میں یہ قطعہ مارچ ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ہے۔"

۲ ۱۸۵۲ء

مخمس

گھِستے گھِستے، پانو میں زنجیر آدھی رہ گئی[1]
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی؟
کھینچ کے، قاتل، جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے، جانِ عاشقِ دلگیر، آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا، لے کے چشمِ پُر نم، اُس کے رو برو
کیوں کہا تو نے کہ: "کہہ دل کا غم اس کے رو برو"؟
بات کرنے میں نکلتا ہے دم، اُس کے رو برو
کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ[2] اُس کے رو برو
ہم نشیں، آدھی ہوئی تقریر، آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا؟ مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار
خواب و بیداری پہ، کب ہے، آدمی کو اختیار!
مثلِ زخم، آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار
کھینچتا تھا، رات کو میں خواب میں، تصویرِ یار
جاگ اُٹھا میں، کھینچتی تصویر آدھی رہ گئی

۱؎ تتمہ، دہلی اردو اخبار — ۱۱، اپریل ۱۸۵۲ء

۲؎ عرشی صاحب نے جب دیکھا کہ دیوانِ ظفر اور دہلی اردو اخبار میں "ہم نہ" لکھا ہے اور قوافی نم، غم، دم، وغیرہ ہیں تو انھوں نے اسے "نہ ہم" کر دیا۔ عرشی صاحب کی یہ ترمیم درست نہیں۔ ترمیم سے نہ فع کے وزن پر ہو گیا ہے جو جائز نہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہاں غالب نے کب کہا ہو گا یعنی "کب ہم اُس کے رو برو"۔

۳؎ دیکھیے دیوانِ ظفر (دہلی اردو اخبار میں جو چھپا تھا)

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں، اے دلنواز
مستیِ چشمِ سیہ سے، چل کے، ہو ویں چارہ ساز
تو صدائے پا سے جاگا تھا جو محوِ خوابِ ناز
دیکھتے ہی، اے ستمگر، تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر، آدھی رہ گئی

اس بتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات؟
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ، گزری ہوں گی راتیں پان سات
اُس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشیدِ پُر تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں
ہاں، فراوانی اگر کچھ ہے، تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم، گھاٹا ہے ہر یک بات میں
کم نصیبی اِس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
آتے ہی، خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی

سب سے، یہ گوشہ، کنارے ہے، گلے لگ جا رے
آدمی کو کیوں پکارے ہے؟ گلے لگ جا رے
سر سے گر چادر اتارے ہے، گلے لگ جا رے
مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے؟ گلے لگ جا رے
وصل کی شب، اے بتِ بے پیر، آدھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے یوں پھر گئے؟
پر نصیب اپنا، انھیں جاتا سنا ہوں، پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
آکے آدھی دور، میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے؟
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو، یا رب، کب کی بات؟
کچھ نہیں کہتا کسی سے، سن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں، ہاں وہ پرسوں شب کی بات؟
نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی

ہو تجلّی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب
ہاں، چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا یہی گزرتی رات سب
پاس میرے وہ جو آئے بھی، تو بعد از نصفِ شب
نکلی آدھی حسرتِ تقریر، آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے، ہو "دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے؟ گیا کیوں اُس کے گھر؟"
جان کی پاؤں اماں! باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو ظفر
واں کے جانے میں، مری توقیر آدھی رہ گئی

غزلیات

● ۱۸۵۳ء

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟
جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاںستاں، ناوکِ نازِ بے پناہ م
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں م
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بُوالہوس کی شرم م
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں؟[1]

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع م
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟

ہاں، وہ نہیں خدا پرست، جاؤ، وہ بے وفا سہی م
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں ؟ م
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

● ۱۸۵۳ء

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیونکر ہو م کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیونکر ہو؟[2]
ہمارے ذہن میں، اس فکر کا ہے نام وصال م کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیونکر ہو؟
ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے ؟ م حیا ہے اور یہی گو مگو، تو کیونکر ہو؟
تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا! م بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیونکر ہو؟
اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ م جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیونکر ہو؟
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا م وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیونکر ہو؟
ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنھیں ہماری قدر م ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ، تو کیونکر ہو؟

ع۱ دہلی اردو اخبار، جلد ۱۵ نمبر ۷ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۸۵۳ء

ع۲ دہلی اردو اخبار، مطابق ۶ر مارچ ۱۸۵۳ء

غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گماں تسلّی کا م نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیونکر ہو؟
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر، کہ مجھ کو قرار م یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیونکر ہو؟
مجھے جنوں نہیں، غالبؔ، ولے بقولِ حضورؔ: م ”فراقِ یار میں تسکین ہو، تو کیونکر ہو؟“

۱۸۵۳ء

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو م
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو؟[۱]
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے م
نہ دی ہوتی خدایا، آرزوے دوستِ دشمن کو!
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر م
کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو!
خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں م
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں م
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں، تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا م
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے؟ م
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے م
مرے بت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۱؎ دہلی اردو اخبار ۸ مئی ۱۸۵۳ء

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو م
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لُٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا؟ م
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویا ہوں جواہر کے؟ م
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں، غالب م
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

● ۱۸۵۳ء

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے م
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟[۱]

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر، اے جذبۂ دل م
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے م
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر م
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو؛ وہ بھلے ہیں، تو کیا؟ م
ہاتھ آویں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے، نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ م
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

---

[۱] خط بنام حقیر، ۸ جون ۱۸۵۳ء

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالب!
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

۱۸۵۳ء

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟ [1]
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟

یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟

رہے ہے یوں گہ و بے گہ، کہ کوے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟

زہے کرشمہ، کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب؟
کہ بِن کہے بھی اُنھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں، وہ پُرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے؟"

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے؟

اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

---

۱ - دہلی اردو اخبار (تتمہ) جلد ۱۵، نمبر ۱۷، ۲۴ اپریل ۱۸۵۳ء

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے! م
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں؟ لیکن م
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

● ۱۸۵۳ء

کہوں جو حال، تو کہتے ہو: "مدعا کہیے" م تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے[۱]
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" م مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا کہیے"
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جاوے م نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں م وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے، اس کے نہ مدعی بنیے م جو ناسزا کہے، اس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے م کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے م کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے م کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے م روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے م طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا، غالب م خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

● ۱۸۵۳ء

بازیچۂ اطفال ہے، دنیا، مرے آگے م ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے[۲]

۱۔ خط بنام حقیر اپریل ۱۸۵۳ء - نادراتِ غالب ص ۳۵
۲۔ دہلی اردو اخبار (تتمہ) - ۲۲ مئی ۱۸۵۳ء

اک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک م اک بات ہے، اعجازِ مسیحا، مرے آگے
جز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور م جز وہم نہیں، ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں، صحرا، مرے ہوتے م گھستا ہے جبیں خاک پہ، دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے م تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں! م بیٹھا ہے بُتِ آئنہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار م رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا م کیوں کر کہوں: "لو نام نہ اُنکا مرے آگے"!
ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر م کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام م مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے م آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو م آتا ہے ابھی، دیکھیے، کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے م رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا م غالب کو بُرا کیوں کہو؟ اچھا، مرے آگے!

● ۱۸۵۳ء

ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرِ پُر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے، جو دل نکلے، تو دم نکلے [۱]
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے م
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے [۲]
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اُس کی گردن پر م
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

۱؎ ارمغانِ غالب ص ۳۰۸ - شیخ محمد اکرام ۲؎ تتمہ دہلی اردو اخبار - ۱۹ جون ۱۸۵۳ء
۳؎ دہلی اردو اخبار - ۴ دسمبر ۱۸۵۳ء

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر، ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم، تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ، غالب، اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۸۵۳ء

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے[۱]

خستگی کا تم سے کیا شکوہ؟ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں، چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے، کب دن پھریں حمّام کے

عشق نے، غالب، نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱ دہلی اردو اخبار - ۴ دسمبر ۱۸۵۳ء

سلام

۱۸۵۴ء

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو[1]

نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا ستایش ہے؟
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اُس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اُس کو

خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟

فروغِ جوہرِ ایماں، حسین ابنِ علی
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اُس کو

کفیلِ بخششِ اُمّت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے، کشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو

وہ، جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل، سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو

عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جنّ و انس و مَلک سب بجا کہیں اُس کو

بہت ہے، پایۂ گردِ رہِ حسین، بلند
بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اُس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک، ہر ایک ذرّۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اُس کو

ہمارے درد کی یارب، کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو

---

[1] ۔ "رامپور رضا لائبریری میں ایک مخطوط "دستورالعملِ اودھ" کے نام سے محفوظ ہے۔ اس میں مجتہد العصر مولانا سیّد محمد لکھنوی کی شاہِ اودھ کے سامنے پیش کی ہوئی تحریریں اور ان پر شاہ کی توقیعیں منقول ہیں۔ اسیر لکھنوی، جو شاہ کے میر منشی تھے، اس کتاب کے مرتب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سلام اس دستورالعمل میں مجتہد العصر کے مکتوب مورخہ ۴ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ (۳۰ جولائی ۱۸۵۴ء) کے متصل بعد (۸۴ب) نقل کیا گیا ہے۔ جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان تاریخوں کے کچھ ہی بعد میرزا صاحب کی طرف سے موصول ہوا ہوگا۔ سلام کا عنوان ہے "یا اسد اللہ الغالب" اور خاتمے پر میرزا صاحب کی مہر (اسد اللہ الغالب) بھی نقل کر دی گئی ہے۔"

ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حسنِ صبر کی داد؟ — مگر نبی و علی مرحبا کہیں اس کو
زمامِ ناقہ، کف اس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں — پس از حسین علی پیشوا کہیں اس کو
وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے — کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد — پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں — علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ — برا نہ مانیے، گر ہم برا کہیں اس کو
علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین — کرے جو ان سے برائی، بھلا کہیں اس کو؟
نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے — رکھے امام سے جو بغض، کیا کہیں اس کو؟
بھرا ہے، غالبِ دلخستہ کے کلام میں درد — غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

غزلیات

● ۱۸۵۴ء

درد منت کشِ دوا نہ ہوا م — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا [ع۱]
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ م — اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟ م — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب م — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی م — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ م — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی م — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما م — کام گر رک گیا، روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے! م — لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں: م — "آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

ع۱ ۔ گلستانِ سخن (تالیف قبل از اپریل ۱۸۵۴ء) میں اس غزل کا ایک شعر انتخاب ہوا ہے۔

۱۸۵۴ء

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا م پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا؟[۱]

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں، کہ ہم م الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا م روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں م تیرا بیمار، برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے، وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا م خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا م کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خوناب م حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کل م کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے م دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

۱۸۵۴ء

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟ م
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو[۲]

نتیجہ اپنی آہوں کا ہے شکلِ مثنوی پورا!
ہیولے صورتِ کابوس پھر خواب گراں کیوں ہو؟[۳]

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟ م
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ "ہم سے سرگراں کیوں ہو؟"

کیا غم خوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو! م
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

---

۱ خط بنام نبی بخش حقیر (بعد از ۱۸ جون ۱۸۵۴ء) نادراتِ غالب ص ۵۶ ۔ ۲ خط بنام نبی بخش حقیر مورخہ ۱۸ جون ۱۸۵۴ء

۳ رسالہ طوفان، نواب شاہ (پاکستان) جولائی ۱۹۵۱ء ۔ فاضل زیدی۔

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر، اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ کہہ سکتے ہو: "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو، جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں، کیوں ہو؟"

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالب؟
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

۱۸۵۴ء قطعہ

خجستہ انجمنِ طُوےِ میرزا جعفر | کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں، غالب | نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"؟ ۱۸۵۴ء

۱۸۵۴ء قطعہ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی | ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالب سے: "تاریخ اس کی کیا ہے؟" | تو بولا: "انشراحِ جشنِ جمشید" ۱۲۷۰ھ

● ۱۸۵۴ء

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ، اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے[1]
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ، روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے؟

رباعیات

۱

● ۱۸۵۴ء

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ ، آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں[2]؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالب، لیکن ، خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

۲

● ۱۸۵۴ء

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں ، عشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں[3]
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا ، کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

۳

● ۱۸۵۴ء

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے ، کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے[4]
کہتے ہیں: "کہیں خدا سے" اللہ اللہ ، وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

---

[1] - خط بنام نبی بخش حقیر مورخہ ۴ جون ۱۸۵۴ء - نادراتِ غالب ۵۳، ۵۸

[2] - خط بنام حقیر ۴ جون ۱۸۵۴ء نادراتِ غالب ص ۵۳

[3]، [4] - خط بنام حقیر - ۸ مارچ ۱۸۵۵ء نادراتِ غالب ص ۱۷

غزلیات

● ۱۸۵۴/۵۵ء

جَور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟ ٭ کہتے ہیں: "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا؟"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ٭ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟
لاگ، ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ ٭ جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا؟
ہولیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟ ٭ یارب، اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے ٭ آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ ٭ مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے؟" ٭ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

● نومبر ۱۸۵۴ء تا مئی ۱۸۵۷ء

ملے، دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے، ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب[1]

قطعہ

● ۱۸۵۵ء

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ ٭ اے جہاں دارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں ٭ تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ٭ ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز ٭ رُوشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ، از روئے ننگِ بے ہنری ٭ ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

---

[1] قیاس ہے کہ یہ شعر وفاتِ ذوق کے بعد اور مئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کسی وقت کہا گیا ہوگا۔ ذوق ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو فوت ہوئے۔

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی | جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں، کہ ہوں | بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح | تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ گزار
بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر! | نسبتیں، ہو گئیں مشخّص، چار
نہ کہوں آپ سے، تو کس سے کہوں؟ | مدّعائے ضروریُ الاظہار
پیر و مرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں | ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے، آخر | تا نہ دے، بادِ زمہریر، آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ | جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے، اب کے سال | کچھ بنایا نہیں ہے، اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ | بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں! | دھوپ کھاوے کہاں تلک جاں دار
دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی | وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار!
میری تنخواہ جو مقرّر ہے | اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے، مردے کی چھماہی ایک | خلق کا ہے اسی چلن پہ، مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات | اور چھماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں، ہر مہینے، قرض | اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں چہارم کا | ہو گیا ہے شریک، ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں | شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے | ہے، زباں میری، تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے | ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار
ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد | قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا! | آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ | تا نہ ہو، مجھ کو، زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام | شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس! | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۱۸۵۵ء قطعہ

نصرت الملک بہادر، مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے، تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ، مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے، توسنِ دولت کی عناں!
یہ دعا، شام و سحر، قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی، مجھکو، ملاقات سے ہے
اس پہ گزرے نہ گمان ریو و ریا کا زنہار!
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

۱۸۵۵ء قطعہ

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو
رکھ دیں چمن میں، بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیے، اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
غالب، یہ کیا بیاں ہے؟ بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے، جن کے آگے سیم و زر، مہر و ماہ، ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں، اور بے شمار چاند

۱۸۵۵ء قطعہ

سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی، اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

۱۸۵۵ء قطعہ

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے — جہاں میں، جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

۱۸۵۵ء قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں، کرتے ہوئے سلام — اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

۱۸۵۵ء مثنوی

ہاں، دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامے کا صفحے پہ رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لکھیے؟ — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا، کون، مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ — آئے، یہ گوے اور یہ میداں!
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے، جلے پھپھولے، تاک
نہ چلا جب کسی طرح، مقدور — بادۂ ناب بن گیا، انگور
یہ بھی، ناچار، جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہوتا ہے
مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے؟ — آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟
نہ گل اس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار — جب خزاں آئے، تب ہو اسکی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی، گر یہ شیرینی — ق کوہکن، باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان   پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر   ق   کہ دواخانۂ ازل میں، مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام   شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے   باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے، بحکمِ رب الناس   بھر کے بھیجے ہیں، سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات   مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں، یہ نخل   ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل!

تھا ترنجِ زر ایک، خسرو پاس   ق   رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس!

آم کو دیکھتا اگر یک بار   پھینک دیتا طلائے دستِ افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا   نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ   طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم   ناز پروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو   نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد   عدل سے اُس کے، ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں، عزِ شان، و جاہِ جلال   زینتِ طینت، و جمالِ کمال

کار فرمائے دین و دولت و بخت   چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا، ہُما کا سایہ ہے   خلق پر، وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور   جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو!   وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو!   اور غالب پہ مہرباں رکھیو!

• غزلیات ۱۸۵۵ء

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   م   شبِ فراق سے، روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے؟   م   بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے ان کے، تو "مرحبا" نہ کہیں م جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو "خیر باد" نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں م کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
علاوہ عید کے، ملتی ہے اور دن بھی شراب م گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟ م دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو، غالب م یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

۱۸۵۵ء

آئی اگر بلا، تو جگر سے ٹلے نہیں م ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کِشت کو[۱]
کیجے بیاں بجا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں م بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنِشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مَے و انگبیں کی لاگ م دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟ م ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو
غالب، کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے م خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کِشت کو

۱۸۵۵ء

پھر اس انداز سے بہار آئی م کہ ہوئے، مہر و مہ، تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک م اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر م رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی م بن گیا، روئے آب پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لیے م چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر م بادہ نوشی ہے، بادپیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی، غالب م شاہِ دیندار نے شفا پائی

م[۱] - یہ شعر 'یادگارِ غالب' میں درج ہے۔

۱۸۵۵ء

رَوندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی م اِترائے کیوں نہ، خاکِ سرِ رہگزار کی
جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ م لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے م کیونکر نہ کھائیے؟ کہ ہوا ہے بہار کی

رباعی

● ۱۸۵۵ء

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے م بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار م فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

● ۱۸۵۶ء قادر نامہ

(قادر) اور (اللہ) اور (یزداں) خدا
ہے (نبی، مُرسَل، پیمبر) رہنما[1]
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (امام)
وہ رسول اللہ کا قائم مقام
ہے (صحابی) دوست، خالص (ناب) ہے
جمع اُس کی، یاد رکھ، (اَصحاب) ہے
بندگی کا، ہاں، (عبادت) نام ہے
نیک بختی کا (سَعادت) نام ہے
کھولنا (افطار) ہے، اور روزہ (صَوم)
(لَیل) یعنی رات، دن اور روز (یَوم)
ہے (صلوٰۃ)، اے مہرباں، اسمِ نماز
جس کے پڑھنے سے ہو راضی، بے نیاز
جانماز اور پھر (مُصَلّا) ہے وہی
اور (سَجّادہ) بھی گویا ہے وہی
(اسم) وہ ہے، جس کو تم کہتے ہو نام
(کعبہ، مکّہ) وہ، جو ہے (بَیتُ الحرام)
گرد پھرنے کو کہیں گے ہم (طواف)
بیٹھ رہنا گوشے میں ہے (اِعتکاف)
پھر (فلک، چرخ) اور (گردون) اور (سِپہر)
آسماں کے نام ہیں، اے رشکِ مہر

---

[1] ۔ قادر نامہ از غالب ۔ پہلا ایڈیشن ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) در مطبع سلطانی دہلی۔

(مہر) سورج، چاند کو کہتے ہیں (ماہ)
(غرب) پچھم، اور پورب (شرق) ہے
آگ کا (آتش) اور (آذر) نام ہے
(تیغ) کی ہندی اگر تلوار ہے
بنولا (راسو) ہے اور (طاؤس) مور
(نجم) ہے تارا، اور ٹھلیا ہے (سبُو)
(چاہ) کو کہتے ہیں ہندی میں کنواں
دودھ جو پینے کا ہے وہ (شیر) ہے
(سینہ) چھاتی، (دست) ہاتھ اور (پاے) پانو
(ماہ) چاند (اختر) ہیں تارے، رات (شب)
(اُستخواں) ہڈی کا ہے، اور ہے (پوست) کھال
تل کو (گُنجد) اور (رخ) کو گال کر
کنکھڑا (سرطان) ہے، کچھوا (سنگ پشت)
ہے (شکم) پیٹ، اور بغل (آغوش) ہے
ہندی میں (عقرب) کا بچھو نام ہے
ہے وہی (کژدُم)، جسے (عقرب) کہیں
ہے، لڑائی (حرب) اور (جنگ) ایک چیز
ناک (بینی)، (پرّہ) نتھنا، (گوش) کان
(چشم) ہے آنکھ، اور (مژگاں) ہے پلک
منھ پہ گر جھری پڑے، (آژنگ) جان
مسّا (آژخ) اور چھالا (آبلہ)
اونٹ (اُشتر)، اور (اُشغر) سیہ ہے
ہے (زنخ) ٹھوڑی، گلا ہے (حنجرہ)
ہے (زنخ) ٹھوڑی، (ذقن) بھی ہے وہی
پھر (غلیواز) اس کو کہیے، جو ہے چیل

ہے محبّت (مہر)، لازم ہے نباہ
(ابر) بدلی، اور بجلی (برق) ہے
اور انگارے کا (اَخگر) نام ہے
فارسی پگڑی کی بھی (دستار) ہے
(کبک) کو ہندی میں کہتے ہیں چکور
(آب) پانی، (بحر) دریا، نہر (جُو)
(دُود) کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
(طفل) لڑکا، اور بوڑھا (پیر) ہے
(شاخ) ٹہنی، (برگ) پتّا، (سایہ) چھانو
دانت (دنداں)، ہونٹ کو کہتے ہیں (لب)
(سگ) ہے کتّا اور گیدڑ ہے (شغال)
گال پر جو تل ہو اُس کو (خال) کر
(ساق) پنڈلی، فارسی مُٹھی کی (مشت)
کہنی (آرنج) اور کندھا (دوش) ہے
فارسی میں بھوں کا (اَبرو) نام ہے
(نیش) ہے وہ ڈنک جس کو سب کہیں
(کعب) ٹخنا اور (شتالنگ) ایک چیز
کان کی لَو (نرمہ) ہے اے مہربان
آنکھ کی پُتلی کو کہیے (مردُمک)
فارسی چھینکے کی تو (آونگ) جان
اور ہے دائی جنائی (قابلہ)
گوشت ہے (لحم)، اور چربی (پیہ) ہے
سانپ ہے (مار) اور جھینگر (زنجرہ)
(خاد) ہے چیل، اور (زغن) بھی ہے وہی
چیونٹی ہے (مور) اور ہاتھی ہے (پیل)

لومڑی (روباہ)، اور (آہو)، ہرن
(اسپ) جب ہندی میں گھوڑا نام پائے
(گربہ) بلّی، (مُوش) چوہا، (دام) جال
(خر) گدھا، اور اس کو کہتے ہیں (الاغ)
ہندی چڑیا، فارسی (گُنجشک) ہے
(تابہ) ہے، بھائی، تَوے کی فارسی
نام مکڑی کا (کَلاش) اور (عنکبوت)
(لَپشہ) مچھّر، اور مکّھی ہے (مَگس)
بھیڑیا (گرگ) اور بکری (گوسپند)
نام (گُل) کا پھول، (شبنم) اوس ہے
(سقف) چھت ہے، (سنگ) پتھر، اینٹ (خشت)
(خار) کانٹا، (داغ) دھبّہ، (نغمہ) راگ
(زر) ہے سونا، اور (زرگر) ہے سُنار
(ریش) داڑھی، موچھ (سَبلت) اور (بُروت)
زندگانی ہے (حیات)، اور (مرگ) مَوت
(جملہ) سب، اور (نصف) آدھا، (ربع) پاؤ
ہے (جَراحت) اور (زخم) اور گھاؤ (ریش)
(ہفت) سات، اور (ہشت) آٹھ، اور (بست) بیس
ہے (چہل) چالیس، اور (پنجہ) پچاس
(دوش) کل کی رات، اور امروز (آج)
چاہیے ہے ماں کو (مادر) جاننا
پھاوڑا (بیل) اور درانتی (داس) ہے
سبز ہو جب تک، اُسے کہیے (گیاہ)
(چکسہ) پُڑیا، (کیسہ) کا تھیلی ہے نام
(اخلکندو) جھُنجھُنا (نیزہ) ہے زور

(شمس) سورج، اور (شعاع) اُس کی کرن
(تازیانہ) کیوں نہ کوڑا نام پائے
(رِشتہ) تاگا، (جامہ) کپڑا، (قحط) کال
(دیگدان) چُولھا جسے کہیے (اُجاغ)
مینگنی جس کو کہیں وہ (پشک) ہے
اور (تیہو) ہے کَوے کی فارسی
کہتے ہیں مچھلی کو (ماہی) اور (حوت)
(آشیانہ) گھونسلا، پنجرہ (قفس)
(میش) کا ہے نام بھیڑ، اے خود پسند
جس کو نقّارہ کہیں، وہ (کوس) ہے
جو بُرا ہے، اُس کو ہم کہتے ہیں (زِشت)
(سیم) چاندی، (مس) ہے تانبا، (لخت) جاگ
(مَوز) کیلا، اور ککڑی ہے (خیار)
(احمق) اور (نادان) کو کہتے ہیں اُوت
(شُوے) خاوند، اور ہے (اَنباغ) سَوت
(صَرصَر) آندھی، (سَیل) نالا، (باد) باؤ
بھینس کو کہتے ہیں، بھائی، (گاؤمیش)
(سی) اگر کہیے، تو ہندی اُس کی تیس
(نا امیدی) یاس، اور (اُمّید) آس
(آرد) آٹا، اور (غلّہ) ہے اناج
اور بھائی کو (برادر) جاننا
فارسی (کاہ) اور ہندی گھاس ہے
خشک ہو جاتی ہے، تب کہتے ہیں (کاہ)
فارسی میں دھپّے کا (سیلی) ہے نام
(بادفر) پھرکی ہے، اور ہے (دُزد) چور

انگبیں (شہد) اور (عسل) ہے، اے عزیز
نام کو ہیں تین، پر ہے ایک چیز

(آجل) اور (آروغ) کی ہندی ڈکار
(مے) شراب، اور پینے والا (میگسار)

روئی کو کہتے ہیں (پنبہ) سن رکھو
آم کو کہتے ہیں (انبہ) سن رکھو

(خانہ) گھر ہے، اور کوٹھا (بام) ہے
قلعہ (دِژ)، کھائی کا (خندق) نام ہے

ہے بنولا (پنبہ دانہ) لاکلام
اور تربُز (ہندوانہ) لاکلام

گر (دریچہ) فارسی کھڑکی کی ہے
(سرزنش) بھی فارسی جھڑکی کی ہے

ہے کہانی کی (فسانہ) فارسی
اور شعلے کی (زبانہ) فارسی

(نعل در آتش) اُسی کا نام ہے
جو کہ بے چین اور بے آرام ہے

(لیپت) اور ستو کو کہتے ہیں (سویق)
(ژرف) اور گہرے کو کہتے ہیں (عمیق)

(تار) تانا، (پود) بانا، یاد رکھ
(آزمودن) آزمانا یاد رکھ

(بوسہ) چُمّی، چاہنا ہے (خواستن)
کم ہے (اندک)، اور گھٹانا (کاستن)

خوش رہو، ہنسنے کو (خندیدن) کہو
گر ڈرو، ڈرنے کو (ترسیدن) کہو

ہے (ہراسیدن) بھی ڈرنا، کیوں ڈرو؟
اور (جنگیدن) ہے لڑنا، کیوں لڑو؟

ہے گزرنے کی (گزشتن) فارسی
اور پھرنے کی ہے (گشتن) فارسی

وہ (سرودن) ہے، جسے گانا کہیں
ہے وہ (آوردن)، جسے لانا کہیں

(زیستن) کو جانِ من، جینا کہو
اور (نوشیدن) کو تم پینا کہو

دوڑنے کی فارسی ہے (تاختن)
کھیلنے کی فارسی ہے (باختن)

(دوختن) سینا، (دریدن) پھاڑنا
(کاشتن) بونا ہے (رُفتن) جھاڑنا

(کاشتن) بونا ہے، اور (کِشتن) بھی ہے
کاتنے کی فارسی (رِشتن) بھی ہے

ہے ٹپکنے کی (چکیدن) فارسی
اور سننے کی (شنیدن) فارسی

گوندنا (جستن)، (بریدن) کاٹنا
اور (لیسیدن) کی ہندی چاٹنا

دیکھنا (دیدن)، (رمیدن) بھاگنا
جان لو، (بیدار بودن) جاگنا

(آمدن) آنا، بنانا (ساختن)
ڈالنے کی فارسی (انداختن)

(سوختن) جلنا، چمکنا (تافتن)
ڈھونڈھنا (جستن)، ہے پانا (یافتن)

باندھنا (بستن)، (کشادن) کھولنا۔
(داشتن) رکھنا ہے، (سنجیدن) تولنا

تولنے کو اور (سنجیدن) کہو / پھر خفا ہونے کو (رنجیدن) کہو

فارسی سونے کی (خفتن) جانیے / منھ سے کچھ کہنے کو (گفتن) جانیے

کھینچنے کی ہے (کشیدن) فارسی / اور اُگنے کی (دمیدن) فارسی

اونگھنا پوچھو، (غنودن) جان لو / مانجھنا چاہو، (زدودن) جان لو

ہے قلم کا فارسی میں (خامہ) نام / ہے غزل کا فارسی میں (چامہ) نام

کس کو کہتے ہیں غزل؟ ارشاد ہو / ہاں، غزل پڑھیے، سبق گر یاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستا یار کا / جمعے کے دن وعدہ ہے دیدار کا

وہ چُراوے باغ میں میوہ جسے / پھاند جانا، یاد رہو، دیوار کا

پُل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ / ورنہ، تھا اپنا ارادہ پار کا

شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھیڑ / آج عالم اور ہے بازار کا

لال ڈگّی پر کرے گا جا کے کیا؟ / پُل پہ چل، ہے آج دن اتوار کا

گر نہ ڈر جاؤ، تو دکھلاؤں تمھیں / کاٹ، اپنی کاٹھ کی تلوار کا

واہ بے! لڑکے، پڑھی اچھی غزل / شوق، ابھی سے ہے تجھے، اشعار کا

لو سنو کل کا سبق، آ جاؤ تم / پوزی (افسار) اور دُمچی (پاردم)

چھلنی کو (غربال، پرویزن) کہو / چھید کو تم (رخنہ) اور (روزن) کہو

(چہ) کے معنی کیا، (چگویم) کیا کہوں / (من شوم خاموش) میں چپ ہو رہوں

(باز خواہم رفت) میں پھر جاؤں گا / (نان خواہم خورد) روٹی کھاؤں گا

فارسی کیوں کی (چرا) ہے، یاد رکھ / اور گھنٹالا (درا) ہے، یاد رکھ

(دشت)، (صحرا) اور جنگل ایک ہے / پھر (سہ شنبہ) اور منگل ایک ہے

جس کو (ناداں) کہیے وہ انجان ہے / فارسی بینگن کی (بادنجان) ہے

جس کو کہتے ہیں جمائی، (فازہ) ہے / جو ہے انگڑائی، وہی (خمیازہ) ہے

(بارہ) کہتے ہیں کڑے کو، ہم سے پوچھ / باڑ ہے (تالار)، اِک عالم سے پوچھ

جس طرح گہنے کی (زیور) فارسی / اُس طرح ہنسلی کی (دبرگر) فارسی

بھِڑ کی، بھائی، فارسی (زنبور) ہے / دستپنا (انبُر) ہے اور (آتشوَر) ہے

فارسی (آئینہ)، ہندی آرسی / اور ہے کنگھی کی، (شانہ)، فارسی

ہینگ (اَنگوزہ) ہے، اور (اَرزیر) رانگ — (ساز) باجا، اور ہے آواز (بانگ)
(زوجہ) جورو، (بَیزنہ) بہنوئی کو جان — (خَشم) غصّے اور بدخوئی کو جان
لوہے کو کہتے ہیں (آہن) اور (حدید) — جو نئی ہو چیز، اُسے کہیے (جدید)
ہے (نَوا) آواز، ساماں اور اُوَل — (نرخ) قیمت، اور (بہا) یہ سب ہیں مول
(سیر) لہسن، (تُرب) مولی، (تَرّہ) ساگ — کھا (بخور)، برخیز اُٹھ، (بگریز) بھاگ
روئی کی پونی کا ہے (پاغُندہ) نام — (دُوک) تکلے کو کہیں گے لاکلام
(گیتی) اور (گیہاں) ہے دُنیا، یاد رکھ — اور ہے (ندّاف) دھنیا، یاد رکھ
(کوہ) کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ — فارسی (گُلخن) ہے اور ہندی ہے بھاڑ
تکیہ (بالش)، اور بچھونا، بسترا — اصل (بستر) ہے، سمجھ لو تم ذرا
بسترا بولیں سپاہی اور فقیر — ورنہ (بستر) کہتے ہیں برنا و پیر
(پیر) بوڑھا اور (برنا) ہے جواں — جان کو البتہ کہتے ہیں (رواں)
اینٹ کے گارے کا نام (آژند) ہے — ہے (نصیحت) بھی وہی، جو (پند) ہے
(بند) کو (اَندرز) بھی کہتے ہیں، ہاں — (اَرض) ہے، پر (مرز) بھی کہتے، ہاں
کیا ہے (اَرض) اور (مرز)، تم سمجھے؟ (زمیں) — (عُنق) گردن، اور پیشانی (جبیں)
(آس) چکّی، (آسیا) مشہور ہے — اور (فوفَل) چھالیا مشہور ہے
بانسلی (نَے) اور (جَلاجِل) جھانجھ ہے — پھر (سَتَروَن) اور (عَقیمہ) بانجھ ہے
(کحل) سُرمہ، اور سلائی (میل) ہے — جس کو جھولی کہیے، وہ (زَنبیل) ہے
پایا قادر نامے نے آج اختتام — اک غزل تم اور پڑھ لو، والسلام!

غزل

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں — مانتا، لیکن ہمارا دل، نہیں
علم سے ہی قدر ہے انسان کی — ہے وہی انسان، جو جاہل نہیں
کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار؟ — آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو، رک رک کر، سبق؟ — ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں
جس نے قادرِ نامہ سارا پڑھ لیا — اُس کو آمدنامہ کچھ مشکل نہیں

مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء

متفرق

تیسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۱ء

چوتھا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۲ء

(پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) کے تمام اشعار چوتھے مطبوعہ ایڈیشن تک شاملِ دیوان ہو کر شائع ہو چکے تھے)

قطعہ

۱۸۵۷ء

بسکہ فعّالِ ما یُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا [۱]
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر، بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے، ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی، واں نہ جا سکے، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب! — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا؟

بعد از ۱۸۵۷ء — قطعہ

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قتل — بچے ہے جوگ مایا اور دیبی [۲]
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا — مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

۱۔ "یہ قطعہ اردوے معلیٰ: ۲۱۰ میں علائی کے نام کے ایک خط کے ساتھ بغیر کسی حوالے کے چھپا ہے۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ہے۔"

۲۔ تعیین کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر'، ص ۴۴۔

مارچ ۱۸۶۱ء یا قبل از مارچ ۱۸۶۱ء

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں — بزمِ شادی ہے فلک، کاہ کشاں ہے سہرا[۵۱]
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو — ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

بعد از ۱۸۵۷ء غزلیات

آپ نے "مَسَّنِیَ الضُّرُّ" کہا ہے تو سہی — یہ بھی، یا حضرتِ ایوب، گِلا ہے تو سہی[۵۲]
رنج، طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیونکر؟ — ذہن میں، خوبیِ تسلیم و رضا، ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ با مّید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد، مگر روزِ جزا، ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری — نہ سہی، لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی
غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نباہی اُس نے — نہ سہی ہم سے، پر اُس بت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں، مَیں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالبؔ؟ — شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

بعد از ۱۸۵۷ء

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب — کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن، دیکھا[۵۳]

بعد از ۱۸۵۷ء

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی — روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا[۵۴]
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر — آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۹۰، ۴۹

۱۸۵۸ء قصیدہ

مَلاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیِ ایلن برونِ والا جاہ [۱]

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محضِ رحمت و رافت، کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے، جس کی نگاہ

وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جس کی پرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرِ کاہ

زمیں سے سودۂ گوہر اٹھے، بجائے غبار
جہاں ہو، توسنِ حشمت کا اس کے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو، تو انجم کہیں: "الٰہی، شکر!"
وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے: "خدا کی پناہ"

یہ اس کے عدل سے اضداد کو ہے، آمیزش
ق
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں، بہ ہر سرِ راہ

ہژبر، پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے اُلجھی ہوئی، دمِ روباہ

نہ آفتاب، و لے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، و لے مرتبے میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اُس کو دیا ایک خوبرو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

زہے ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو، اُس کا تارِ نگاہ

خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا، شرق سے تا غرب، اِس کا بازی گاہ

جوان ہو کے کرے گا، یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اِس کے ہوں روز و شبِ سپید و سیاہ

کہے گی خلق اِسے: "داورِ سپہر شکوہ"
لکھیں گے لوگ اِسے: "خسروِ ستارہ سپاہ"

---

۱ یہ قصیدہ میرزا صاحب نے منشی شیو نراین کی طرف سے مسٹر ایلن برون کے یہاں بیٹا پیدا ہونے کی مبارکباد پر لکھا تھا۔ چنانچہ منشی جی کو خط میں لکھتے ہیں:

"کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ ۱۴ شعر کا قصیدہ کہہ کر تمھارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست، خصوصاً میرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں ایک روشِ خاص سے سنہ ۱۸۵۸ء کا اظہار کر دیا ہے۔ خدا کرے، تمھارے پسند آوے۔ تم خود قدر دانِ سخن ہو، اور تین استاد اس فن کے تمھارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔"

عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے — روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ
ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے — پڑے نہ قطعِ خصومت میں، احتیاجِ گواہ
یہ ترکتاز سے، برہم کرے گا کشورِ روس — یہ لے گا، بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ
سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون — یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے، شام و پگاہ
یہ جتنے سینکڑے ہیں، سب ہزار ہو جاویں — دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
امیدوارِ عنایات، شیونارائن — کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ — تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ!

غزل ۱۸۵۸ء

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟ م — غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؟ ۱
تمہاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم، کیا ہے م — رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟
یہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا — خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟
وہ داد و دید، گراں مایہ شرط ہے، ہمدم — وگرنہ، مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟
کٹے تو شب کہیں، کاٹے، تو سانپ کہلاوے — کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے؟
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود — کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی م — یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

مرثیہ قبل از ۱۸۶۰ء

ہاں، اے نفسِ بادِ سحر، شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں، چشمِ ملائک سے رواں ہو ۲

---

۱ خط بنام مرزا حاتم علی مہر۔ اوائل جولائی ۱۸۵۸ء
۲ سرورِ ریاض ص ۲۳ تا ۲۷۔ از ریاض الدین احمد سندیلوی ریاض تخلص۔
یہ بند خود غالب نے "اپنے دستِ خاص سے لکھ کر" ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء کو احمد سندیلوی کو دیے تھے۔

اے زمزمۂ قُم، لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو   اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو؟
بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو   ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے، محابا نہیں ہم کو   گر چرخ بھی جل جائے، تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگرِ نُہ پایہ جو مدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے؟

کچھ اور ہی عالم ہے، دل و چشم و زباں کا   کچھ اور ہی نقشا، نظر آتا ہے، جہاں کا
کیسا فلک؟ اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا   ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس رُو سے کہو، برق نہیں ہے

شعر

قبل از ۱۸۶۰ء

اگر ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہیے   نہ ہونے پر ہیں یہ باتیں دہن کی[۱]

۱۸۶۰ء قطعہ

جب کہ سیّد غلام بابا نے   مسندِ عیش پر جگہ پائی[۲]
ایسی رونق ہوئی برات کی رات   کہ کواکب ہوئے تماشائی

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے "غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر" ص ۵
[۲] خط بنام سیّاح۔ ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء

قطعہ

۱۸۶۰ء

ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے ۔۔۔ فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی[۱]
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات ۔۔۔ کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

قبل از ۱۸۶۱ء غزلیات

حالت ترے عاشق کی یہ اب آن بنی ہے ۔۔۔ اعضا شکنی ہو چکی، اب جاں شکنی ہے[۲]

قبل از ۱۸۶۱ء

گھر سے نکالنا ہے اگر، ہاں نکالیے ۔۔۔ ناحق کی حجتیں نہ، مری جاں، نکالیے[۳]
لیں بوسہ، یا مصیبتِ ہجراں بیاں کریں ۔۔۔ اک مُنہ ہے، کون کون سے ارماں نکالیے

قبل از ۱۸۶۱ء

جو معشوق زلفِ دوتا باندھتے ہیں ۔۔۔ مرے سر سے کالی بلا باندھتے ہیں[۴]

قبل از ۱۸۶۱ء

وصل میں ہجر کا ڈر یاد آیا ۔۔۔ عینِ جنت میں سقر یاد آیا؛

---

[۱] خط بنام سیاح ۔ ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء

[۲، ۳، ۴] ۔ قاضی معراج دھولپوری مرحوم بحوالہ "باغِ مہر"، تاریخِ ختمِ کتاب، صفر ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۸۶۱ء ۔ مضمون شائع شدہ ہماری زبان ۔ ۸ اگست ۱۹۶۱ء

● ۱۸۶۱ء

قطعہ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب
آب و تابِ انطباع کی پائی[۱]

فکرِ تاریخِ سال میں، مجھ کو
ایک صورت نئی نظر آئی

ہندسے پہلے سات سات کے دو
دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی

اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا
با ہزاراں ہزار زیبائی

سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم
بے شمولِ عبارت آرائی

مگر، اب ذوقِ بذلہ سنجی کو
ہے جداگانہ کار فرمائی

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
بامیدِ سعادت افزائی

غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم
جن سے ہے چشمِ جاں کو بینائی

اور بارہ امام ہیں، بارہ
جن سے ایماں کو ہے توانائی

اُن کو، غالب، یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولائی

● ۱۸۶۲ء

قطعہ

سلیم خاں، کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں
حکیم حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کلام[۲]

تمام دہر میں اُس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

اسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش
ہوئی ہے، مبدعِ عالم سے، اس قدر انعام

کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اُس کے
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام

عجیب نسخۂ نادر، لکھا ہے، ایک، اُس نے
کہ جس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام

نہیں کتاب، ہے اک گنجِ نکاتِ بدیع
نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام

کل، اُس کتاب کے سالِ تمام میں، جو مجھے
کمالِ فکر میں دیکھا خرد نے، بے آرام

۱۔ تذکرہ سراپا سخن از محسن علی محسن لکھنوی۔ ص ۲۹۳ - ۱۲۷۷ھ (۶۱/۶۰ ۱۸ء)۔

۲۔ مکاشیفِ حکمت از حکیم محمد سلیم خاں دہلوی مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء، ص ۱۸۸

کہا یہ "جلد کر" تو اس میں سوچتا کیا ہے؟ ۔۔۔ لکھا ہے "نسخۂ تحفہ"، یہی ہے سالِ تمام
(۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء))

غزل

● ۱۸۶۲ء

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز؟ ۔۔۔ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے ۔۔۔ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

رباعیات

● ۱۸۶۲ء

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے؟ ۔۔۔ ثاقبؔ! حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب ۔۔۔ غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے[1]

اے روشنیِ دیدہ، شہاب الدین خاں ۔۔۔ کٹتا ہے، بتاؤ، کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟ ۔۔۔ سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟[1]

---

[1] حاشیہ۔ "یہ دونوں رباعیاں گویا دو منظوم خط ہیں جو مرزا صاحب نے نواب شہاب الدین خاں بہادر ثاقبؔ کو لکھے تھے۔ مولوی مہیش پرشاد مرتبِ خطوطِ غالبؔ کی رائے میں یہ ۱۸۶۲ء کے بعد کا معلوم ہوتی ہیں"

۱۸۶۳ء

تا

۱۸۶۷ء

متفرقات

۱۸۶۳ء قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ[1]

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بروزِ شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار، گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا جو تاگا ہے
یہ کہکشاں ہے، کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ پڑے؟
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ، کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ "دیکھ کتنی، اُٹھالائے گا یہ تار، گرہ؟"

کہا کہ "چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے، تو پاویں گے نو ہزار گرہ"

نود آسماں ہے مہاراؤ راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں، اُس تار پر نثار، گرہ

وہ راؤ راجہ بہادر کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی الفور، دانہ وار، گرہ

انھیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نوبہار، گرہ

انھیں کی سالگرہ کے لیے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار، گرہ

انھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں، گہرہائے شاہوار، گرہ

انھیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں، ثمرہائے شاخسار، گرہ

سن اے ندیم، برس گانٹھ کے، یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار، گرہ؟

پئے دعائے بقائے جنابِ فیض مآب
لگے گی، اس میں، ثوابت کی استوار گرہ

ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے بنے
بلا مبالغہ، درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے وہ جاذبہ اُس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں، رشتۂ زنہار گرہ

---

[1] "یہ قصیدہ راجہ شیودان سنگھ والیِ الور کی شان میں لکھا گیا ہے۔ مصرعِ اوّل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی ۲۰ ویں سالگرہ کا جشن منایا جا رہا تھا۔ چونکہ وہ راجہ بنی سنگھ کے ۱۸۵۷ء میں مرنے پر، ۱۳ برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے، اور ستمبر ۱۸۶۳ء میں بلوغ کو پہنچ کر با اختیار کیے گئے۔ (ریاض الاثار مصنفۂ مولوی رحمٰن علی خاں: ۹۴، طبع نولکشور ۱۸۷۳ء)۔ اس حساب سے یہ قصیدہ اسی مہینے میں لکھ کر پیش کیا گیا ہوگا۔"

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں، کہ اس زمانے میں — بچی نہ، از پئے بندِ نقابِ یار، گرہ
متاعِ عیش کا ہے، قافلہ چلا آتا — کہ جادہ رشتہ ہے، اور ہے شتر قطار گرہ
خدا نے دی ہے وہ، غالب کو، دستگاہِ سخن — کروڑوں ڈھونڈھ کے لاتا یہ خاکسار گرہ
کہاں مجالِ سخن؟ سانس لے نہیں سکتا — پڑی ہے غم کی، مرے دل میں، پیچدار گرہ
گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات — زباں تک آ کے، ہوئی اور استوار گرہ
کھلے یہ گانٹھ، تو البتہ دم نکل جاوے — بُری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار گرہ
ادھر نہ ہوگی، توجہ حضور کی جب تک — کبھی کسی سے کھلے گی نہ، زینہار گرہ
دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں، از رہِ بُغض — پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ
دل اُس کا پھوڑ کے نکلے، بشکلِ پھوڑے کے — خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھار گرہ

مثنوی

١٨٦٤ء

اے جہاں آفریں، خدائے کریم — صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم[1]
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور — یہ ہمیشہ بہ صد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادماں رہیں! — اور غالب پہ مہرباں رہیں

١؎ "یہ مثنوی میرزا غالب کے مرتبہ اُس بے نام اُردو کتابچے کے دیباچے کے آخر میں ملتی ہے، جو اُنھوں نے ہندوستان میں مقیم انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے اپنے منتخب رقعات اور اشعار پر مشتمل ترتیب دیا تھا۔ میرزا صاحب نے یہ کتابچہ جس زمانے میں میکلوڈ صاحب کی نذر کیا ہے، اس زمانے میں وہ پنجاب کے فنانشل کمشنر تھے۔ تاریخ پنجاب مصنفہ دیبی پرشاد: ۱۹۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو منٹگمری نے پنجاب کی گورنری سے استعفا دیا، تو اُن کی جگہ میکلوڈ صاحب کا تقرر کیا گیا۔ لہٰذا اِس کتابچے کو کم از کم ۱۸۶۴ء میں مرتب ہونا چاہیے۔"

شعر

● ۱۸۶۴ء

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے[1] — روٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر من گیا

رباعی

● ۱۸۶۴ء

اے منشیِ خیرہ سر، سخن ساز نہ ہو — عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو[2]
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ — لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

قصیدہ

● ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

مرحبا! سالِ فرخی آئیں — عیدِ شوال و ماہِ فروردیں[3]
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار — مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز — لیک، بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو، اس اکیس دن میں، ہولی کی — مجلسیں جابجا، ہوئیں رنگیں
شہر میں، کو بہ کو، عبیر و گلال — باغ میں سو بہ سو، گل و نسریں

۱۔ خط بنام بے تجر مورخہ ، مارچ ۱۸۶۴ء

۲۔ لطائفِ غیبی ص ۱۵

۳۔ خط بنام منشی سیل چند" مورخہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۵ء سے پتا چلتا ہے کہ "یہ قصیدہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔" یہ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے جشنِ صحت کے موقع پر کہا گیا تھا۔

شہر، گویا، نمونۂ گلزار
باغ، گویا، نگار خانۂ چیں

تین تیوہار اور ایسے خوب
جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
منعقد، محفلِ نشاط قریں

محفلِ غسلِ صحتِ نواب
رونق افزائے مسندِ تمکیں

بزم گہ میں، امیرِ شاہ نشاں
رزم گہ میں، حریفِ شیرِ کمیں

پیش گاہِ حضور، شوکت و جاہ
خیر خواہِ جناب، دولت و دیں

جن کی مسند کا، آسماں، گوشہ
جن کی خاتم کا، آفتاب نگیں

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
آسماں، ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور
نہ ہوئی ہو، کبھی بروئے زمیں

انجمِ چرخ، گوہر آگیں فرش
نورِ مے، ماہ ساغرِ سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں

وہ نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال
یہ، ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے
ژالہ آسا بچھے ہیں، دُرِّ ثمیں

نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا
جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون
یاں، وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں

ق
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار
بجمالِ تجمّل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری توسن
اور بالِ پری ہے، دامنِ زیں

نقشِ سُمِّ سمند سے، یکسر
بن گیا، دشت، دامنِ گلچیں

فوج کی گردِ راہ مشک فشاں
رہرووں کے مشام عطر آگیں

بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت
فوج کا ہر پیادہ، ہے فرزیں

موکبِ خاص، یوں زمیں پر تھا
جس طرح ہے سپہر پر، پرویں

ق
چھوڑ دیتا تھا گور کو، بہرام
ران پر داغ تازہ دے کے، وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں

بندہ پرور، ثنا طرازی سے
مدّعا، عرضِ فنِّ شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا منہ / گر کہوں بھی، تو کس کو آئے یقیں
اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے / ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی، خدا کی پناہ! / دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
حرف، اظہار ہے، ارادت کا / ہے قلم کی، جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے / غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں / تم رہو زندہ جاوداں، آمیں!

شعر

● قبل از ۱۸۶۵ء

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا / ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا[1]

قطعہ

● ۱۸۶۵ء

مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک / رہا ہے زور سے، ابرِ ستارہ بار، برس[2]
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر / "بیار" لائیے "گلنار گوں"، "بباد" ابر برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی / درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو "ملک" وہ کہے / "امیر کلبِ علی خاں، جئیں ہزار برس"
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں / کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے / بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات / خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر" ص ۱۴۴

۲۔ یہ قطعہ خط بنام نواب کلب علی خاں، مورخہ ۱۱ ر اگست ۱۸۶۵ء کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

غزلیات

۱۸۶۵ء

لطفِ نظّارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے — جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے ۱
ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری! — دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ — ساتھ حُجّاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں — لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدّت سے، و لے آج ندیم — دل کے ٹکڑے بھی کئی، خون کے شامل آئے
سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں — عکس تیرا ہی، مگر، تیرے مقابل آئے
موت بس ان کی ہے جو مر کے وہیں دفن ہوئے — زلیت اُن کی ہے جو اُس کوچے سے گھائل آئے
بن گیا سُبحہ وہ زُنّار، خدا خیر کرے! — وہ جو نازک ہے کمر اُس پہ بہت دل آئے
اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالب — آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

۱۸۶۵ء

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی — تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی ۲
غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ؟ — ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی
تم ہو بت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟ — تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل، دلِ مضطر میرا — کعبہ ایک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ! — خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب؟ — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

۱۔ "یہ غزل میرزا صاحب نے اپنے دوسرے سفرِ رام پور میں ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے کہی تھی۔ اس زمانے میں کلب علی خاں بہادر رام پور کے نواب تھے۔"

۲۔ خط بنام نواب امین الدین احمد خاں مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۵ء۔

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں — زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
مجھ سے، غالب، یہ علائی نے غزل لکھوائی — ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

قطعہ

● ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں [۱]
سر آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم — کہ دلی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے، جو ہے مقلوبِ جاں — نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے پوچھو کہ "کل کیا پکائیں؟"
وہ کھٹے کہاں پائیں، املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؟
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار — کہو، اُس کو، کیا، کھا کے ہم، حظ اٹھائیں؟

غزلیات

● ۱۸۶۶ء

دربہ امیرِ کلب علی خاں کے ہوں مقیم — ق شائستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں [۲]
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں، اسد — خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

۱۔ یہ قطعہ نواب علائی کی بیاض سے لیا گیا ہے۔ "بیاض کے اندراجات میں ترتیبِ تاریخی کا لحاظ نہیں ہے، چنانچہ ان سے پہلے ۲ جنوری ۱۸۶۷ء کا اور ان کے بعد ۵ اپریل ۱۸۶۵ء کا اندراج ملتا ہے۔ اس لیے انھیں تقریباً اسی زمانے کا مان لیا ہے۔"

۲۔ میرزا صاحب نے اس زمین میں اپنی دو برسوں پرانی غزل ...... کا مقطع حذف کر کے اور آخر میں یہ دو شعر بڑھا کر، نواب کلب علی خاں بہادر والیِ رامپور کی خدمت میں ۹ جون ۱۸۶۶ء کو بھیجی تھی۔"

۱۸۶۶ء

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے[1]

قطعہ

۱۸۶۷ء

گڑگانویں کی ہے جتنی رعیت، وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی[2]
سو یہ نظر فروز قلمدان نذر ہے
مسٹر کوآن صاحبِ عالی مقام کی

۱۸۶۷ء

ہندوستان کی بھی عجب سر زمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور[3]
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصلِ تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دور دور

۱۔ "یہ شعر میرزا صاحب نے اپنے مکان واقع محلہ بلی ماران کے متعلق کہا تھا۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق یہ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا، اور اسی میں اُن کا انتقال ہوا تھا۔ (یادگار: ۸۰)۔ مولانا مہر کی رائے ہے کہ اس میں میرزا صاحب جنوری ۱۸۶۶ء کے بعد منتقل ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو غالب: ۵۰۸ (طبع سوم)۔"

۲۔ مسٹر جے۔ ایل۔ کوآن اسسٹنٹ کمشنر گوڑگانواں۔ فروری ۱۸۶۶ء میں دہلی سوسائٹی کے ممبر بنائے گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۸۰، ۸۱۔ قطعہ کوآن صاحب کی ٹرانسفر کے موقع پر کہا گیا تھا۔

۳۔ رسالۂ دہلی سوسائٹی، شمارہ نمبر ۱۔ احوالِ غالب، ص ۱۷۲ تا ۱۹۲

غزلیات

● ۱۸۶۷ء

شبِ وصال میں، مونس گیا ہے، بن، تکیہ — ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن، تکیہ[1]
خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟ — کہ بن گیا ہے، خمِ جعدِ پُر شکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں، بستر — ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام — جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ
مزا ملے، کہو، کیا خاک ساتھ سونے کا؟ — رکھے جو بیچ میں، وہ شوخِ سیم تن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر! — اٹھا سکا نہ نزاکت سے، گلبدن تکیہ
ہوا ہے، کاٹ کے چادر کو، ناگہاں غائب — اگرچہ زانوئے نل پہ رکھے، دمن تکیہ
بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ، صبح ہونے تک — رکھو نہ شمع پہ، اے اہلِ انجمن تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن — اٹھائے کیونکر، یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
غش آ گیا جو، پس از قتل، میرے قاتل کو — ہوئی ہے اس کو مری لاشِ بے کفن تکیہ
جو بعدِ قتل، مرا دشت میں مزار بنا — لگا کے بیٹھتے ہیں اس سے راہ زن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا — کہ سانپ فرش ہے، اور سانپ کا ہے من تکیہ
روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام" — اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم، فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

● ۱۸۶۷ء

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں، دشتِ غم میں، آہوئے صیاد دیدہ ہوں[2]

۱۔ گلدستۂ انجمن مطبوعہ مطبع اکبری دہلی، ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء)۔ مرتب محمد عبدالکریم۔

۲۔ خط بنام نواب علائی مورخہ ۳ مارچ ۱۸۶۷ء

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں، دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں، نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیے، نہیں وہ، مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل (؟) خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ وَرَع کے حلقے میں، ہر چند، ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں، میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح، اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

قصیدہ

● ۱۸۶۷ء

کرتا ہے چرخ، روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو، سلام[۱]

حق گوے و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام

جم رتبہ میکلوڈ بہادر، کہ وقتِ رزم
ترکِ فلک کے ہاتھ سے، وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو انھیں آہنگِ میکشی
واں، آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام

چاہا تھا میں نے، تم کو مہِ چاردہ کہوں
ق دل نے کہا کہ "یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام

دو رات میں تمام ہے، ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علی الدّوام"

سچ ہے، تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے
دریاے نور ہے، فلکِ آبگینہ فام

میری سنو، کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضّلات سے، ہو مرجعِ انام

اخبارِ لودھیانہ میں، میری نظر پڑی
تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ تلخ کام

۱؎ اس قصیدے کے تیرہویں شعر سے ظاہر ہے کہ مرزا نے جب یہ شعر کہا تو وہ ستر برس کے ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس کلام کو ۱۸۶۷ء کا کہا ہوا تسلیم کرنا چاہیے۔

ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو، جگر   کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا   جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم   نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز   جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ، تیرھویں   استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اُس بزمِ پُر فروغ میں، اِس تیرہ بخت کو   نمبر ملا نشیب میں، از روے اہتمام
سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش، دل   دربار میں جو، مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام
عزت پہ، اہلِ نام کی، ہستی کی، ہے، بنا   عزت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر   اُس ناز کا، فلک نے لیا مجھ سے، انتقام
آیا تھا، وقت ریل کے کھلنے کا بھی، قریب   تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
اس کشمکش میں آپ کا مداحِ دردمند   آقاے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
جو واں نہ کہہ سکا، وہ لکھا ہے حضور کو   دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام
ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں   سلطانِ برّ و بحر کے در کا ہوں میں غلام
وکٹوریہ کا، دہر میں، جو، مدح خواں ہو   شاہانِ عصر، چاہیے، لیں عزت اُس سے وام
خود، ہے تدارک اس کا، گورمنٹ کو ضرور   بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالب ہے جس کا نام
امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال   بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے، قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو   چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام
دستورِ فنِ شعر یہی ہے، قدیم سے   یعنی، دعا پہ مدح کا، کرتے ہیں اختتام
ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے   اقلیمِ ہند و سند سے تا ملکِ روم و شام!

اکتوبر / نومبر

قطعہ

● ۱۸۶۷ء

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں   حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر   کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ   اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم

رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے — مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم[1]

رام پور ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال — دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں — ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں، دستِ کرم

ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام — دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبحدم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں — سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبذا! باغِ ہمایونِ تقدس آثار — کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلکِ شرع کے، ہیں، راہرو و راہ شناس — خضر بھی یاں اگر آجائے، تو لے اُن کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سخن — اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق، رقم

حق سے کیا مانگیے؟ اُن کے لیے جب ہو موجود — ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل — دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے — دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا، عالم

اولاً، عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال — ثانیاً، دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

شعر

بعد از ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے — عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے[2]

---

[1] یہ قطعہ بنام نواب کلب علی خاں بہادر مورخہ ۵ رجب سنہ ۱۲۸۴ھ (۳ نومبر ۱۸۶۷ء) کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اور تاحال دریافت شدہ مرزا غالب کا یہ آخری کلام ہے۔

[2] (ل) آبِ حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر (دمِ واپسیں الخ) کہا تھا۔"

(ب) یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں:

"مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بے ہوش ہو جاتے تھے جس روز انتقال ہوگا، اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے

حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا : دمِ واپسیں الخ"

(ج) مرقع ادب مرتبہ صفدر مرزا پوری کے ص ۹۱ پر غالب کا ایک خط بنام مولانا احمد حسین مینا مرزا پوری، مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء درج ہے۔ اس میں مرزا لکھتے ہیں

"مولوی فرزند علی صاحب اخگر کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا۔۔

۔۔۔۔ فقیر تو ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔۔۔۔۔۔ (وہ)

جب چاہیں اپنا کلام (برائے اصلاح) بھیج دیں۔۔۔۔۔۔"

معلوم ہوتا ہے چند ہی دنوں بعد، مینا مرزا پوری کے خط کے ساتھ ہی جناب اخگر کا خط مع غزل پہنچ گیا۔ اس کے جواب میں، اصلاح شدہ غزل واپس کرتے ہوئے مرزا نے یہ بھی لکھا

"قبلۂ حاجات، میرا حال کیا پوچھتے ہیں۔ زندہ ہوں مگر مُردے سے بدتر۔ جو حالت میری آپ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما گئے تھے، اب تو اس سے بھی بدتر ہے۔ مرزا پور کیا آؤں، ایسا سوائے سفرِ آخرت اور کسی سفر کی نہ مجھ میں طاقت ہے نہ جرأت۔ جوان ہوتا، تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں، تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے"

اس خط سے ثابت ہے کہ اگر اس شعر کو مرزا کی بدیہہ گوئی پر محمول سمجھ لیا جائے اور فرض کر لیا جائے کہ جواب لکھتے وقت یہ شعر بھی قلم سے نکل گیا ہوگا، تو بھی شاید یہ آخرِ اگست ۱۸۶۷ء کے بعد کا فکر کردہ نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

اشاریے

فہرستِ اشعار

ا

تصویر کا ۱۱۲
دود پسند آیا ۱۱۲
صد دل پسند آیا ۱۱۲
بازو تھا ۱۱۳
نگاہِ شرمگیں پایا ۱۱۳
خستن ۱۱۳
ساحل ہا ۱۱۴
کوکب ہا ۱۱۴
نام اُس کا ۱۱۵
شب تھا ۱۱۵
تاثیر آیا ۱۱۵
آواروں کا ۱۱۶
جلوہ گاہ کا ۱۱۶
داغ کا ۱۱۷
غبار اپنا ۱۱۷
دیوانہ تھا ۱۱۸
خرمنِ پروانہ تھا ۱۱۸
پارسائی کا ۱۱۹
بارسائی کا ۱۱۹
طوطی کا ۱۱۹
قاتل کا ۱۲۰
ساغر کا ۱۲۰
شکستن کا ۱۲۰
بالیں کا ۱۲۱
بہاری کا ۱۲۱
منزل ہوا ۱۲۱
گوہر ہوا ۱۲۲
دام کیا ۱۲۲
دہاں ہو جائے گا ۱۲۲
ساغر نہیں ہوتا ۱۲۳
آزردگان کا ۱۲۳
آبلہ پا ۱۲۴
فتراک جڑھا ۱۲۴
فسونِ خواب تھا ۱۲۴
بیتاب تھا ۱۲۵
فانوس تھا ۱۲۵
منزل باندھا ۱۲۶
دل نہیں رہا ۱۲۶

بیاباں میرا	۱۲۷	قدم میرا	۲۲۴
نام رہا	۱۲۷	ضرور تھا	۲۲۴
جو آئینہ ہو گیا	۱۲۸	طور تھا	۲۲۵
پر ہو گیا	۱۲۸	تیرا آشنا	۲۲۵
فشارِ صحرا	۱۲۸	خمیازہ تھا	۲۲۵
غم چند رہا	۱۲۹	دروازہ تھا	۲۲۶
زباں پیدا	۱۲۹	عنواں سمجھا	۲۲۶
جل گیا	۱۲۹	دریا کا	۲۲۶
نقاب اُس کا	۱۳۰	خندہ ہائے بے جا کا	۲۲۷
مینا	۱۳۰	غبار تھا	۲۲۷
زنجیر سے پیدا	۱۳۱	انساں ہونا	۲۲۷
دیوار ہو پیدا	۱۳۱	فریاد آیا	۲۲۵
یک دل ہونا (رباعی)	۲۰۸	پر نہ ہوا تھا	۲۲۸
عالم تھا (" ")	۲۰۸	گوہر نہ ہوا تھا	۲۲۹
تار و پود تھا	۲۲۱	مرد تھا	۲۵۰
حسود تھا	۲۲۱	ساز کا	۲۵۰
مُدّعا پایا	۲۲۲	جاوینگے کیا	۲۵۰
بے دوا پایا	۲۲۲	دوا ہو جاتا	۲۵۱
عریاں نکلا	۲۲۲	نیاں کا	۲۶۹
معنی نہ ہوا	۲۲۳	مزا کیا	۲۶۹
دل باندھا	۲۲۳	مند ہو گیا ہے گویا (رُباعی)	۲۸۰
مقابل باندھا	۲۲۳	ہوا تھا	۲۹۱
گریباں نکلا	۲۲۴	بیاباں ہوتا	۲۹۱

عناں گیر بھی تھا ۲۹۱
راز داں اپنا ۲۹۲
انتظار ہوتا ۲۹۲
کیا ہوتا ۲۹۳
منظر کھلا (قصیدہ) ۳۰۷
سر پر سہرا (سہرا) ۳۰۹
گایا سہرا (") ۳۱۰
گوہر کھلا ۳۱۱
شمار ہوں، بلکہ سوا (رباعی) ۳۱۵
برا نہ ہوا ۳۲۹
پیدا نہ ہوا ۳۳۰
دکھلائیں کیا ۳۳۳
رہنما (قادر نامہ) ۳۳۹
انگلستاں کا (قطعہ) ۳۴۶
کاہکشاں ہے سہرا (سہرا) ۳۴۷
کفن دیکھا ۳۴۷
آزار رہ گیا ۳۴۷
سفر یاد آیا ۳۵۱
من گیا ۳۵۷
ہم کیا ۳۵۹

ب

صدائے عندلیب (قطعہ) ۱۰۴
داغِ شراب ۱۳۱
بالِ عندلیب ۱۳۲
کشا، موجِ شراب ۲۵۱
بند ہو گیا ہے غالب (رباعی) ۲۸۱
سراج الدین کو غالب ۳۳۳

ت

رخسارِ دوست ۱۳۲
مگر انگشت ۱۳۳
حضرت سلامت ۲۵۲
کس وقت ۲۷۸
بشارت (قطعہ) ۳۱۷

ث

سنبلستانی عبث ۱۳۳
مینائی عبث ۱۳۴

ج

در ہے آج ۱۳۴
علاج ۱۳۵
شعلہ پرور ہے آج (رباعی) ۲۰۹
فتنہ پرور ہے آج (") ۲۴۸
مسیحا کا کیا علاج ۲۷۸

چ

آرمیدہ کھینچ ۱۳۵
لغزشِ پا ہیچ ۱۳۵
انتظارِ ساغر کھینچ ۲۲۹

ح

گریباں گل و صبح ۱۳۶

د

ہر یک گرد باد ۱۳۶
عصا، بلند ۱۳۶
بے مَس تا چند ۱۳۷
زباں فریاد ۱۳۷
جفا میرے بعد ۲۲۹
رقصِ ناہید (قطعہ) ۲۳۱
مُشکبو کی ناند (〃) ۲۷۵

ر

خار وخس بہتر ۱۰۴
روغنِ مور ۱۳۸
آفتاب آئینے پر ۱۳۸
گُہر گر ۱۳۸
نگہ آبیار تر ۱۳۹
خرمن پر ۱۳۹
رنگ آخر ۱۳۹
طبیب آخر ۱۴۰
سُوَیدائے بہار (قصیدہ) ۲۱۱
بدندانِ شرار ۲۱۴
در و دیوار ۲۳۰
بیاں باں پر ۲۳۰
دیدار دیکھ کر ۲۷۷
گھر کہے بغیر ۲۹۳
اُن میں ہیں چار (رُباعی) ۳۰۲
گماں اور ۳۱۱
تنہا کوئی دن اور ۳۱۲
آفتاب آثار (قطعہ) ۳۳۳
وُفور (〃) ۳۶۲

ز

گُل ہنوز ۱۴۱
حوصلہ گل ہنوز ۱۴۱
کوہکن ہنوز ۱۴۱
دوختن ہنوز ۱۴۲
طلبگار ہنوز ۱۴۲
مذکور ہنوز ۱۴۲

دندانِ عجز ۱۴۳
خضرِ دراز ۲۳۱
شکست کی آواز ۲۳۱
درخزینۂ راز (مثنوی) ۳۳۶
ایمان عزیز ۳۵۳

س

تارِ نفس ۱۴۳
افسوس و بس ۱۴۳
کفِ افسوس ۱۴۴
دیوار کے پاس ۲۳۲
ستارہ بار برس (قطعہ) ۳۵۹

ش

چنار آتش ۱۴۵
مداد آتش ۱۴۴

ط

راہ غلط ۱۰۴

ظ

جی محظوظ (قطعہ) ۲۳۱

ع

وداع ۱۴۵
زندگانیِ شمع ۱۴۵

غ

بہار داغ ۱۴۶
دیوار باغ ۱۴۶

ف

ہزار حیف ۱۴۶
الم خیز یک طرف ۱۴۷
گزر جاتا صاف (رباعی) ۲۰۹

ک

کاروانِ اشک ۱۴۴
ہوتا تک ۲۳۲
سر ہونے تک ۲۳۳
ذوالفقار ایک ۲۷۵

گ

دُعا نہ مانگ ۱۴۷

ل

کساں ۱۴۸
غزال ۱۴۸
سراپا شکستہ دل ۱۴۸
مادر زاد گُل ۱۴۹
رنگ، دل ۱۴۹
ساغر کشِ حال (رباعی) ۲۰۸
آرزو، یعنی دل (") ۲۰۸
سخنورانِ کامل (") ۲۴۸
خندہ ہائے گل ۲۵۳
اسی طور کا حال (رباعی) ۲۸۰
دال (") ۲۸۵
عدیل (قطعہ) ۲۹۰

م

مدّعا معلوم ۱۴۹
دیدار ہیں ہم ۱۵۰
آب و ہوا گرم ۱۵۰
خطِ پیمانہ ہم ۱۵۰
سرِ دیوانہ ہم ۱۵۱
عمر بس تمام ۱۵۱
آتش خانہ، ہم ۲۳۳
بیکسی کی شرم ۲۷۷
جمالی باہم (رباعی) ۲۸۵
کر رہا ہے سلام (قصیدہ) ۳۰۴
کلام (قطعہ) ۳۵۲
ہفت اقلیم (مثنوی) ۳۵۶
سلام (قصیدہ) ۳۶۴
گلستانِ ارم (قطعہ) ۳۶۵

ن

تاب نہیں ۱۰۵
کیا کہوں ۱۰۶
صبا جاتا ہوں ۱۰۷
قبا کروں ۱۵۱
رم دیکھتے ہیں ۱۵۲
خیاباں ارم دیکھتے ہیں ۱۵۲
آہیں ۱۵۲
خانماں نہیں ۱۵۳
کفن کی فکر ہیں ۱۵۳
صیّادیاں ۱۵۴
یکطرف جلتا ہوں میں ۱۵۴
یار رکھتے ہیں ۱۵۴
اوفتادہ رکھتے ہیں ۱۵۵
ناسور ملتے ہیں ۱۵۵

آستانے میں	۱۵۵	زمانے میں	۲۳۶
دشمن ہیں	۱۵۶	داد، یاں	۲۵۳
پریدہ ہوں	۱۵۶	کہوں یا نہ کہوں	۲۵۳
دمیدہ ہوں	۱۵۷	بتا کہ یوں	۲۵۴
زنجیریں	۱۵۷	سال کہاں	۲۵۴
رسوائی نہیں	۱۵۸	بید نہیں	۲۶۲
نقش پا نہیں	۱۵۸	پر نہیں	۲۶۲
تر نہیں	۱۵۸	تار بھی نہیں	۲۶۲
کار آوردن	۱۵۹	یار بھی نہیں	۲۶۳
مدہوشاں	۱۵۹	جگر میں خاک نہیں	۲۶۳
افسردگاں	۱۵۹	دامن میں نہیں	۲۷۰
فہمیدن	۱۶۰	دور نہیں	۲۷۰
خارِ چمن	۱۶۰	بیداد نہیں	۲۷۱
عالم ہیں (رباعی)	۲۰۹	اٹھا بھی نہ سکوں	۲۷۷
خود ہیں (قصیدہ)	۲۱۲	نامہ بر کو دیکھتے ہیں	۲۷۸
جبیں (")	۲۱۸	سوا ہیں	۲۸۶
جدا باندھتے ہیں	۲۳۴	برا کہتے ہیں	۲۸۶
ہوا باندھتے ہیں	۲۳۴	مرادِ امتحاں نہیں	۲۸۷
نیرنگ نکالوں	۲۳۴	عذاب میں	۲۸۷
رنگ نکالوں	۲۳۵	باب میں	۲۸۸
نمایاں ہیں	۲۳۵	دستگاہِ سخن (قطعہ)	۲۹۹
زنجیر نہیں	۲۳۶	نوحہ گر کو میں	۳۰۱
مستی ایک دن	۲۳۶	پتھر نہیں ہوں میں	۳۰۱

کیا کہتے ہیں	(رُباعی)	۳۰۲
تماشائی کس میں	(" ")	۳۰۳
تکرار کیا کریں		۳۱۱
پنہاں ہوگئیں		۳۱۲
ستائے کیوں		۳۲۰
کہاں سے لاؤں	(قطعہ)	۳۳۲
اُسے عار نہیں	(" ")	۳۳۲
بہم آشنا نہیں	(" ")	۳۳۶
جزا زیبا نہیں		۳۳۷
بلا باندھتے ہیں		۳۵۱
رمضاں	(رُباعی)	۳۵۳
ماہِ فروردیں	(قصیدہ)	۳۵۷
آم کھائیں	(قطعہ)	۳۶۱
در نہیں ہوں میں		۳۶۱
دیدہ ہوں		۳۶۳

و

زلیخا مجھ کو	۱۰۷
سادہ ہو	۱۰۷
نفس کو	۱۶۰
اخترِ ہو	۱۶۱
وضو نہ ہو	۱۶۱
نظارہ سے وا ہو	۱۶۱

صبا گم ہو		۱۶۲
دستِ سبو		۱۶۲
وفاگرِ رو		۲۳۷
عداوت ہی کیوں نہ ہو		۲۵۵
قدم ہے ہم کو		۲۷۱
تاثیر سے نہ ہو		۲۷۸
ہم زباں کوئی نہ ہو		۲۷۸
لگن کے پانو		۲۸۳
گناہ ہو		۲۹۴
گفتگو تو کیونکر ہو		۳۲۱
گلشن کو		۳۲۲
سوا کہیں اس کو	(سلام)	۳۲۸
زباں کیوں ہو		۳۳۰
کشت کو		۳۳۸
رواں ہو	(مرثیہ)	۳۴۹
مقابلِ بازنہ ہو	(رُباعی)	۳۵۷

ہ

عدم باندھ	۱۶۳
از خود رمیدہ	۱۶۳
آئینہ خانہ	۱۶۳
گرداندہ	۱۶۴
دزدیدہ	۱۶۴

مقابل ہے آئینہ ۱۶۴
ساحل نہ پوچھ ۱۶۵
بیاں نہ پوچھ ۱۶۵
شرمسار اندیشہ (رباعی) ۲۰۹
بلا سمجھ ۲۳۷
خوابِ پا سمجھ ۲۳۹
خزاں نہ پوچھ ۲۵۵
یکتا باللہ (رباعی) ۳۰۳
برون والا جاہ (قصیدہ) ۳۴۸
سو ہزار گرہ (") ۳۵۵
جان و تن تکیہ ۳۶۴

ی

سر رشتۂ آزادگی (مثنوی) ۱۰۲
شمشیرِ فولادی ۱۶۶
ہر ایک چینِ پیشانی ۱۶۶
فروزاں کی ۱۶۸
لذت زندگانی کی ۱۶۸
صبحِ محشر کی ۱۶۹
خواب ہوگئی ۱۷۰
عریانی ۱۷۸
گلو سوزی ۱۷۹
ہوئی خامی تری ۱۸۱
حیرت تماشائی ۱۸۴
مژگانِ تماشائی ۱۹۵
چکیدگی ۲۰۲
جہاں خالی ۲۰۴
اشارت کی ۲۰۵
دید سہی (رباعی) ۲۰۸
اصفہانی (قصیدہ) ۲۲۰
سرنگوں، وہ بھی ۲۲۹
یاد آنے کی ۲۳۹
اسامی ۲۴۲
عنقا کرے کوئی ۲۴۳
وا کرے کوئی ۲۴۳
بے زبانی ۲۴۴
کبھی نہ کبھی ۲۴۵
قیامت ڈھیل کی ۲۴۶
شہرت ہی سہی ۲۵۸
قسمت میں عدو کی ۲۶۵
زبانی میری ۲۶۶
کر گئی ۲۷۹
روغنی روٹی (قطعہ) ۲۸۵
نظر نہیں آتی ۲۹۵
دوا کرے کوئی ۲۹۸
دہری (رباعی) ۳۰۲

ظہور کی		۳۰۳	نخچیر سے	۱۶۶
دیگر آدھی رہ گئی	(مخمس)	۳۱۸	نما مجھے	۱۶۷
تماشائی		۳۳۸	ناز ہے مجھے	۱۶۷
رہگزار کی		۳۳۹	رکاب ہے	۱۷۰
دیبی	(قطعہ)	۳۴۶	مشکل ہے	۱۷۰
گلا ہے تو سہی		۳۴۷	تدبیر بہتر ہے	۱۷۱
دہن کی		۳۵۰	خاشاک باقی ہے	۱۷۱
پائی	(قطعہ)	۳۵۰	سرمہ سا نکلتی ہے	۱۷۱
پائی	(")	۳۵۱	حنا نکلتی ہے	۱۷۲
پائی	(")	۳۵۲	ندامت ہے	۱۷۲
سوا اور سہی		۳۶۰	چین پیشانی مجھے	۱۷۲
نام کی	(قطعہ)	۳۶۲	رم آہو مجھے	۱۷۳
			زیرِ لب مجھے	۱۷۳
ے			لعلِ وا زوں ہے مجھے	۱۷۴
بیاباں سے	(قطعہ)	۱۰۳	دام ہے	۱۷۴
چمن زعفراں مجھے		۱۰۸	چاک ہے	۱۷۴
سیماب ہے		۱۰۸	آواز ہے	۱۷۵
سحر جلے		۱۰۸	بیمار ہے	۱۷۵
جی جاتے ہے		۱۰۸	کیا ہو جائیے	۱۷۶
آشیاں پھر جائے		۱۰۸	مژہ برہم زدنی ہے	۱۷۶
سرِ بازار آتا ہے		۱۰۸	وہاں ساختنی ہے	۱۷۶
خوب کیجے		۱۰۹	آرمیدن منع ہے	۱۷۷
قیامت ہے		۱۰۹	آتش زبانی صفت ہے	۱۷۷

محمل کشِ لیلیٰ ہے	۱۷۷	تجھ سا کہیں جسے	۱۸۹
آغوش کشائی ہے	۱۷۸	دشتِ تتار ہے	۱۸۹
نسبی ہے	۱۷۹	مزار ہے	۱۹۰
تو جانے	۱۷۹	خوابناک ہے	۱۹۰
چیدنی جانے	۱۸۰	اختراعِ جلوہ ہے	۱۹۰
موزوں ہے	۱۸۰	جائے خندہ ہے	۱۹۱
انجام ہے	۱۸۰	بہارِ نغمہ ہے	۱۹۱
دادہ ہے	۱۸۱	چراغِ کشتہ ہے	۱۹۲
اُمید ہے	۱۸۲	بارِ بستر ہے	۱۹۲
ناوک خیز ہے	۱۸۲	گراں نہ ہو جاوے	۱۹۲
بیاں تجھ سے	۱۸۳	مضراب ہو جاوے	۱۹۳
چھپایا ہے مجھے	۱۸۳	شیرِ قالی ہے	۱۹۳
دکھاتا ہے مجھے	۱۸۴	حیا ہے	۱۹۴
شمشیر آوے	۱۸۴	زمُرد رقمی ہے	۱۹۴
روانی مانگے	۱۸۵	کبک روی ہے	۱۹۴
بیاباں مجھ سے	۱۸۵	خبر آوے	۱۹۵
مژگاں مجھ سے	۱۸۶	لبریزِ آئیں ہے	۱۹۶
تماشائی ہے	۱۸۶	خوابی کرے	۱۹۶
دہقاں ہے	۱۸۷	مینا کرے	۱۹۷
طوفاں زدہ ہے	۱۸۷	گریبانی کرے	۱۹۷
پنہاں ہے	۱۸۷	زنداں ہے	۱۹۷
بیجا نہ کھینچے	۱۸۸	طوفاں ہے	۱۹۸
جانا نہ کھینچے	۱۸۸	بدنداں ہے	۱۹۸

مینا ہے	۱۹۹	طلبوں سے	۲۳۹
پیدا ہے	۱۹۹	آس ہے	۲۴۰
تقاضا ہے	۱۹۹	محال ہے	۲۴۱
سایہ ہے	۲۰۰	آگ دبی ہے	۲۴۱
سنبل کے تلے	۲۰۰	آفتاب ہے	۲۴۱
آلودہ ہے	۲۰۰	میری بھی خالی ہے	۲۴۲
یہ محرم ہے	۲۰۱	کرامات چاہیئے	۲۴۳
شبستاں ہے	۲۰۱	انتظار نہیں ہے	۲۴۴
نگاریں ہے	۲۰۲	غلط بردار ہے	۲۴۵
پروانہ چاہیئے	۲۰۳	نگہ یادگار ہے	۲۴۵
وار کے	۲۰۳	حاصلی ہے	۲۴۶
آہو ہے	۲۰۳	آشنا ہے	۲۴۶
ماہی ہے	۲۰۴	صدا ہوا ہے	۲۴۷
بادہ آتا ہے	۲۰۴	تمثال کو زنجیر ہے	۲۴۷
شب کاٹے	۲۰۵	دیکھا جائے ہے	۲۵۵
رہ گذر ہے	۲۰۵	لیالی نے مجھے	۲۵۶
چاہ ہے	۲۰۶	کہہ جائے ہے مجھ سے	۲۵۷
کور ہے	۲۰۶	آسمان ہے	۲۵۸
چراغ ہے	۲۰۷	غفلت شعاری ہائے ہائے	۲۵۹
نشینی ہے مجھے (رباعی)	۲۰۹	کیا چاہیئے	۲۵۹
لڑنے کے لئے (")	۲۰۹	کاری ہے	۲۶۰
توڑے	۲۱۱	خواب تو دے	۲۶۱
جُنیاں اٹھائیے	۲۳۸	چراغاں کئے ہوئے	۲۶۱

کم ہوئے	۲۶۳	دوا کیا ہے	۲۹۵
قدم آگے	۲۶۴	خورشیدِ جمال اچھا ہے	۲۹۶
نئے نہیں ہے	۲۶۵	گلا ہوتا ہے	۲۹۶
اعظم ہے	۲۶۵	گفتگو کیا ہے	۲۹۸
پاک ہو گئے	۲۶۶	ہوا کیے	۲۹۹
مطلب ہی بر آوے	۲۶۶	پئے ہوتے	۲۹۹
میری، عریانی، مجھے	۲۶۷	وہ آئے	۳۰۴
خموشی ہے	۲۷۱	طبیعت نہیں مجھے (قطعہ)	۳۰۹
قاتل میں ہے	۲۷۳	آزمائش ہے	۳۱۳
اچھا کہتے	۲۷۵	گلفام بہت ہے	۳۱۴
مارا کہ ہائے ہائے (قطعہ)	۲۷۶	داد کرے (رباعی)	۳۱۵
تعمیر سو ہے	۲۷۸	سنائے نہ بنے	۳۲۳
بدلنے نہیں دیتے	۲۷۹	نامہ بر سے کیا کہتے	۳۲۴
بہار آتی ہے	۲۷۹	تو کیا کہتے	۳۲۵
دیوار میں آوے	۲۷۹	تماشا مرے آگے	۳۲۵
رسا رکھتے تھے	۲۸۳	دم نکلے	۳۲۶
رہتے تھے (قطعہ)	۲۸۳	پیغام کے	۳۲۷
ہمارا نہیں کرتے	۲۸۴	رکھا کرے (قطعہ)	۳۳۲
تمنا نہیں کرتے	۲۸۴	کام کرنے والے (")	۳۳۲
کوئی بتلا دے مجھے	۲۸۴	کس بات سے ہے (")	۳۳۵
آسماں کے لئے	۲۸۵	بن ہوئے (")	۳۳۵
مگر ملے	۲۹۴	طالب ہے (")	۳۳۶
ٹھانی اور ہے	۲۹۴	شیرہ والا نے (رباعی)	۳۳۹

غم کیا ہے	۳۴۹	دل آئے	۳۶۰
جاں شکنی ہے	۳۵۱	ہمسایۂ خدا ہے	۳۶۲
جاں نکالیے	۳۵۱	اللہ ہی اللہ ہے	۳۶۶
بے جاتم نے (رُباعی)	۳۵۳		

نوٹ:۔ اشخاص، کتب و رسائل، مقامات وغیرہ سے متعلق ذیل کے اشاریوں

(ا) کو صرف ضروری نشاندہی تک محدود رکھا گیا ہے۔

(ب) کی ترتیب بلحاظِ حروفِ تہجی بیشتر پہلے ہی حروف تک محدود ہے۔

(ج) میں کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحہ پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

اشخاص وغیرہ

ا

آزاد	۱۳، ۲۸۶، ۳۶۶،	اکبر شاہ ثانی	۸۳، ۸۸،
آزردہ	۱۳، ۹۵،	انیا میواتی	۱۸، ۸۴،
آدم	۲۴۷،	اسیر	۱۸،
آباد	۵۲،	امتیاز علی خان عرشی	۲۰، ۴۲،
آتش	۵۲، ۸۹،	اورنگ زیب	۴۴،
آشوب	۵۸،	اکبر آبادی	۶۹،
آصف	۳۱۷،	احمد علی احمد جہانگیر نگری	۹۴، ۹۶،
		احسن مارہروی	۵۷

امراؤ بیگم (بیگم غالب) ۱۵ ، ۹۰ ، ۹۴ ،
احسان دہلوی ۹۰ ،
انشاء ۸۵ ،
الٰہی بخش خاں معروف ۸۵ ،
اکبر ۹۶ ، ۹۷ ،
امام بخش صہبائی ۹۱ ،
اسرافیل ۲۴۵ ،
اسد ۱۸۷ ، ۲۱۳ ، ۲۲۲ ، ۲۴۱ ،
امین الدین امین دہلوی ۹۴ ،
ابنِ مریم ۲۹۸ ،
ابراہیم ۳۰۰ ،
احسن اللہ خاں ۳۰۰ ،
انگمر ۳۴۷ ،

ب

بہادر شاہ ظفر ۱۷ ، ۱۹ ،
بہاری لال مشتاق ۲۷ ، ۲۹ ، ۳۰ ،
بیدل۔ ۱۸ ، ۱۰۹ ، ۱۱۳ ، ۱۲۰ ، ۱۶۴ ،
۱۶۸ ، ۱۸۵ ، ۱۹۵ ،
بے خبر ۳۵۷ ،
باقر علی خاں ۸۹ ، ۹۶ ، ۹۷ ،
بر علی خاں ۱۷۹ ،
بیگم مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی ۴۵ ،
بہزاد ۱۸۸ ،
بینی سنگھ راکولاجیہ ۲۵۵ ،
بلیغ سہارنپوری ۳۲ ،

پ

پرواز اصلاحی ۱۳ ،
پرتگالی ۱۹۳ ،

ت

تلنگے ۹۱ ،
تفتہ ہرگوپال میرزا ۸۷ ، ۸۹ ،
تراب ۲۸۸ ،
تجمل حسین خاں ۲۸۶ ،

ٹ

ٹیپو سلطان ۸۲ ،

ث

ثاقب ۴۵ ، ۳۵۳ ،

ج

جمیل جالبی ۳۰ ،
جوگ مایا

جگن ناتھ فیضی ۴۹،
جنرل اختر یونی ۸۵،
جمشید ۲۱۴، ۲۶۲،
جبریل ۲۹۰،
جان جاکوب (جیکب) ۵۹،

ح

حمید احمد خاں ۲۳،
حالی ۱۳، ۱۷، ۲۶، ۲۷، ۲۷،
۳۰، ۳۹، ۴۳، ۴۴، ۸۴، ۹۰،
حضرت ایوب ۴۹،
حسین علی خاں ۵۴، ۸۹، ۹۷،
حضرت علی ۷۶، ۹۰،
حافظ ۳۰۰،
حکیم آغا خان عیش ۹۶،
حافظ ویران ۹۲،
حضرت صاحب ۵۷،
حضرت محبوب الٰہی ۹۷،
حضرت محمود خان ۳۶۲،
حاجی کلو ۳۵۲،
حکیم محمد سلیم خان ۳۵۲،
حمزہ ۳۳،

خ

خورشید الاسلام ۱۸،
خورشید حسن ۴۸،
خواجہ غلام حسین ۸۲،
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۴۴،
خواجہ حاجی ۸۳، ۸۵،
خضر ۱۱۶، ۱۲۸، ۱۶۶، ۲۰۰، ۲۱۵،
۱۳۱، ۲۳۷، ۲۸۵، ۲۹۴، ۲۹۸، ۲۹۹،
۳۱۷، ۳۳۵، ۳۳۷
خسرو ۲۷۱، ۲۸۳، ۳۳۳،
خان بہادر سید ابو محمد ۶۶،
خوب چند ذکا ۴۰، ۴۱، ۸۴، ۱۵۱،
۱۰۸،
خلیل ۲۹۰،

د

دُلدُل ۱۷۴، ۲۱۴، ۲۱۷، ۲۱۹،
دیبی پرشاد ۳۵۶،
دجلہ ۳۶۶، ۳۳۰،

ذ

ذوق ۴۷، ۹۰، ۹۲،

ذوالفقار ۲۱۶، ۲۷۵،

ر

رومی ۳۰،
راجا رام موہن رائے ۸۷،
راجہ اندر ۲۵۷،

ز

زاہد سہارنپوری ۲۷، ۲۸، ۳۲،
زلیخا ۱۰۷، ۱۹۲، ۱۹۹،
زہرہ ۲۹۰،

س

ساوتری شریمتی کالی داس گپتا رضا ۳،
سید عبدالغفور ۶۸،
سید محمد خاں بہادر ۶۶، ۶۷، ۶۸،
سید عبداللطیف ڈاکٹر ۶۲،
سکندر جہاں بیگم ۴۵،
سید محمد نجف علی جھجری ۹۳،
سری رام لالہ ۵۸،
سرور ۲۴، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۱۰۱،
سید حسین ۴۷،
سید احمد ۴۴
سید حسن بلگرامی ۴۸،
سکندر ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۶۹، ۲۹۸، ۳۱۷، ۳۳۵،
سید عنایت حسین ۱۵،
سیاح ۵۲، ۹۳،
سراج الدین احمد ۸۷،
سر چارلس مٹکاف ۸۵، ۸۶،
سر اکبر حیدری ۶۲،
سلیمان ۲۰۴، ۲۰۶، ۱۸، ۲۷۶، ۳۱۷، ۳۲۳، ۳۲۵،
سید سعادت علی ۹۳،
سلطاں ۲۹۶،
سلیم خاں ۲۵۲،

ش

شیفتہ ۱۷، ۳۹، ۴۳، ۸۷، ۹۶، ۲۸۷،
شیونرائن
شیدا ۴۶، ۴۷،
شاہ عالم ۸۳،
شاہ ظفر ۸۸، ۹۰، ۳۰۲،
شاداں ۹۷،
شیریں ۲۱۴، ۲۲۵، ۲۹۶،

شاہ نصیر ۸۸،

ثمرو کی بیگم ۵۴،

شاہ سید عالم (صاحب عالم مارہروی) ۵۷، ۹۲،

شفق، نواب انوار الدولہ ۵۵،

شمس الدین احمد خاں ۸۷، ۸۸،

شہاب الدین خاں ۴۵،

شاہ جمجاہ (شاہ ظفر) ۲۸۵،

شوق قدوائی ۶۲، ۶۸،

شیخ سعدی ۳۶۶،

شیودان سنگھ والی الور ۳۵۵،

ص

صغیر بلگرامی، ۵۷،

صفدر مرزاپوری ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۶۷،

ط

طالب ۳۰۰،

طپاں ۲۷۵،

ظ

ظفر (دیکھو شاہ ظفر) ۹۰،

ظفریاب خاں ۵۲،

ظہوری ۳۰۰،

ع

عاصی گھنشیام لال ۲۸۶،

عاصی چیتی لال ۴۹،

عارف ۱۴، ۱۵، ۵۴، ۸۹، ۹۰، ۹۶، ۹۷،

علی ۳۶، ۸۴، ۱۰۷، ۱۷۹، ۱۹۹، ۲۱۳، ۲۳۷، ۲۴۰،

عبدالقادر مولوی ۱۵، ۱۶، ۱۷،

عرشی ۳۲، ۶۰، ۶۶، ۷۴، ۷۵، ۲۹۱،

عرشی احمد حسین ۵۱،

علائی (نواب علاؤ الدین احمد خاں) ۴۳، ۵۶، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۶،

عبدالغفور سرور ۵۶، ۵۷،

عیسیٰ ۱۲۰، ۱۸۴، ۱۹۶، ۲۱۸،

عبداللہ بیگ ۸۲،

عزت النساء بیگم ۸۲،

عبدالرزاق شاکر ۱۰۹،

عبدالکریم ۹۳، ۳۶۳۔

علی گبر ۳۰۱

غ

غالب ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ،
۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ،
۲۵ ، ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۳ ،
۳۴ ، ۳۵ ، ۳۶ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۳۹ ،
۴۰ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۶ ، ۴۷
۴۸ ، ۴۹ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۲ ، ۵۳ ،
۵۴ ، ۵۵ ، ۵۷ ، ۵۸ ، ۵۹ ، ۶۰ ،
۶۲ ، ۶۸ ، ۶۹ ، ۷۰ ، ۷۲ ، ۷۳ ،
۷۴ ، ۷۵ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۸۴ ، ۸۵ ،
۸۶ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۱ ،
۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۵ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ،
۱۰۵ ، ۱۰۷ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۲۱۱ ، ۲۳۱ ،
۲۳۶ ، ۲۴۲ ، ۲۵۹ ، ۲۶۷ ، ۲۸۱ ، ۲۹۱ ،
۲۹۹ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۴ ، ۳۱۲ ،
۳۱۸ ، ۳۲۰ ، ۳۲۸ ، ۳۳۳ ، ۳۴۶ ، ۳۴۹ ،
۳۵۶ ، ۳۶۵ ، ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۹۹ ،
غلام رسول ۳۰ ، ۳۱ ،
غنی کشمیری ۳۰ ، ۳۱ ،
غلام فخرالدین عرف میرزا فخرو شاہزادہ ۹۱ ،
غلام نجف خاں ۲۹۹ ، ۳۰۰ ،

ف

فرعون ۱۱۹ ،
فخرالدین علی احمد ۹۷ ،
فضل حق خیرآبادی ۸۵ ،
فرہاد ۱۴۹ ، ۱۹۵ ، ۲۷۰ ، ۲۹۲ ،
۲۹۶ ،
فلاطون ۳۵۲ ۔

ق

قلندر بخش جرات ۸۴ ،
قوقان بیگ خاں ۸۲ ،
قارون ۱۲۹ ،
قتیل ۸۲ ،
قدر بلگرامی ۵۷ ،
قیس۔ مجنوں ۱۱۹ ، ۱۲۱ ، ۱۹۸ ، ۲۲۰ ،
۲۲۲ ، ۲۳۶ ، ۲۴۵ ، ۲۷۶ ، ۳۱۳ ،
قطب الدین باطن ۸۴ ،
قلزم ۲۹۰ ،
قاسم ۲۷۵ ،
قاضی دھولپوری ۳۵۱ ،

ک

کالی داس گپتا رضا ۲۱۵ ، ۲۷۲ ،

کالی دیوی ۴۴،

کوہکن - (فرہاد) ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۸۳، ۳۱۳،

کریم خان داروغہ ۸۷، ۸۸،

کائن ۹۶،

کوآن صاحب ۳۶۲،

کلیم ۲۹۰،

کمال احمد صدیقی ۲۳،

کلب علی خاں، نواب ۹۳، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۶،

کنہیا لال، لالہ ۲۶،

گ

گھنشیام لال عاصی ۲۸۶،

ل

لالہ کنہیا لال ۲۶،

لوہارو ۸۳،

لالہ سری رام ۵۸،

لارڈ الن برا گورنر جنرل ۸۹،

لیلیٰ ۱۶۹، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۲۵، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۷۶، ۳۲۵،

لاڈو بیگم ۸۲، ۹۳،

لقا ۲۹۰،

م

محسن بن شبیر ۱۲، ۱۳،

مالک رام ۴۲، ۴۵، ۶۶، ۷۴، ۷۵،

میرزا بیدل ۱۲،

مفتی صدرالدین آزردہ ۱۳،

مرزا یوسف ۱۵، ۸۲، ۸۴، ۹۳، ۲۶۷،

مولوی عبدالقادر رامپوری ۱۵، ۱۶، ۱۷،

مرزا قوقان بیگ خان ۸۲،

مصحفی ۸۵،

محمد ایوب قادری ۱۷،

مانی ۱۶۸، ۱۸۵، ۱۸۷، ۲۱۱،

مشتاق بہاری لال ۲۶،

مفتی محمد انوار الحق ۲۳،

مرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب ۴۵،

مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی ۵۰،

محمد حسین خان ۷۸،

مشفق خواجہ ۳۰، ۳۳،

مجنوں ۱۲۷، ۱۵۳، ۱۶۶، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۹، ۲۱۴، ۲۲۴، ۲۲۸،

۲۳ ، ۲۳۶ ، ۲۴۲ ، ۲۹۶ ،
مرزا احمد بیگ خاں تپاں ۳۹ ،
مومن ۴۷ ، ۴۸ ، ۹۰ ،
میر تقی میر ۱۵ ، ۴۴ ، ۸۴ ، ۲۳۶ ، ۲۹۲ ،
ملا طاہر غنی کشمیری ۲۹ ،
میجر سید حسن بلگرامی ۴۶ ، ۴۷ ،
مرزا حاتم علی ۵۵ ،
مولانا نظامی بدایونی ۴۶ ،
معظم الدولہ میر محمد خاں سرور ۲۳ ،
مولوی سراج الدین احمد ۲۳ ،
مولوی محمد معظم ۸۴ ،
مہر، غلام رسول ۳۲ ، ۴۵ ، ۴۹ ،
میاں داد خاں سیاح ۵۲ ، ۹۳ ،
مرزا علی سوداگر ۸۷ ،
مولوی عبد الرزاق
مولوی احسن اللہ خان ثاقب ۴۲ ،
مولوی سید محمد لکھنوی ۱۹ ،
مہاجر ۱۹ ،
میجر فلر ۹۵ ،
محمد شاہ ۸۲ ،
مرزا یوسف علی بیگ خاں ۹۱ ،
مرزا رحیم بیگ ۹۳ ،
میر امانی اسد ۸۴ ،

مفتی محمد صدر الدین آزردہ ۱۳ ، ۹۵ ،
مولوی احتشام الدین ۵۴ ،
مولانا نظامی بدایونی ۶۲ ، ۶۸ ،
مہیش پرشاد ۶۶ ، ۳۵۳ ،
مرزا عبد اللہ بیگ خاں ۸۳ ،
مہاراجہ رنجیت سنگھ ۸۸ ،
میر قمر الدین ۷۸ ،
مجروح ۵۵ ، ۵۶ ،
معظم زمانی (عرف بگا بیگم) ۹۷ ،
مولانا فضل حق خیر آبادی ۹۱ ،
میر نظام الدین ممنون ۸۹ ،
مولوی احمد علی احمد ۹۴ ، ۹۶ ،
ماسٹر پیارے لال ۹۵ ،
مولوی امین الدین دہلوی ۹۵ ،
محسن علی محسن لکھنوی ۳۵۲ ،
مکلوڈ ۳۵۶ ، ۳۶۳ ، ۳۶۴ ،
منشی سیل چند ۳۵۷ ،
منصور ۲۷۱ ،
محمد حسین آزاد ۱۳ ، ۲۸۶ ، ۳۶۶ ،
مینا احمد حسین ۳۶۷ ،
مولانا حالی ۳۶۲ ،
معتمد الدولہ بہادر ۲۷۲ ،

ن

نیر رخشاں نواب ضیا الدین احمد خان
۲۵ ، ۶۳ ، ۶۶ ، ۶۸ ، ۷۰ ، ۷۲ ،
۷۳ ، ۷۴ ، ۷۷ ، ۳۱۲ ،

ناظم نواب یوسف علی خاں (دیکھیے یوسف علی خاں ناظم)
۴۲ ، ۴۳ ، ۵۴ ، ۷۸ ، ۹۱ ، ۹۴ ،
۳۵۷ ،

ناظر عالم ۵۲ ،

نواب شمس الدین احمد خان ۴۵ ، ۸۶ ،

ناسخ ۵۲ ، ۸۸ ، ۲۳۶ ،

نبی صلعم ۵۶ ، ۱۷۹ ، ۲۱۲ ،

نواب عماد الملک

نواب تجمل حسین ۷۴ ، ۷۵ ،

نور الحسن ہاشمی صاحب ۵۰ ،

نصر اللہ بیگ خاں ۸۳ ،

نواب انوار الدولہ بہادر شفق ۵۵ ،

نظامی بدایونی ۶۲ ، ۶۸ ،

نبی بخش حقیر ۸۹ ،

نواب احمد بخش خاں ۸۳ ، ۸۴ ، ۸۵ ،
۸۶ ،

نواب علی بہادر، باندہ ۸۶ ، ۳۰۱ ،

نواب امین الدین خان احمد ۲۶۰ ،

نظم طباطبائی ۵۲

و

ولیم فریزر ۸۸ ،

واصل خان ۳۵۲ ،

وحشت ۲۸۷ ،

ہ

ہد ہد ۱۹۵ ،

ہرگوپال تفتہ ۵۴ (دیکھو تفتہ)

ی

یوسف علی خان بہادر ناظم، نواب ۴۲ ،
۴۳ ، ۵۴ ، ۷۸ ، ۹۱ ، ۹۴ ، ۳۵۷ ،
(دیکھیے ناظم)

یعقوب ۱۶۲ ، ۲۱۵ ، ۲۳۰ ، ۲۴۵ ،

یوسف علی بیگ ۸۲ ، ۸۳ ،

یوسف ۲۶۹ ، ۲۹۲ ، ۳۱۳ ، ۳۴۴ ،

یوسف مرزا ۱۵ ، ۸۲ ، ۸۴ ، ۹۳ ،
۲۴۷ ،

مقامات وغیرہ

آ

آگرہ ۲۶ ، ۳۳ ، ۸۲ ، ۸۴ ، ۹۰ ، ۹۲ ، ۲۹۹ ،

آزاد لائبریری علی گڑھ ۶۶ ،

ا

اجمیر ۱۶ ، ۱۷ ،

اکبرآباد ۳۳ ،

انگلستان ۸۷ ،

اورنگ زیب ۳۰ ،

اکمل المطابع ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۵ ، ۹۶ ،

ب

بھوپال ۵۱ ،

بمبئی ۱۲ ، ۹۰ ،

بریلی ۹۴ ،

بستی نظام الدین ۹۵ ،

بلی ماران ۳۶۲ ،

باندہ ۳۰۱ ، ۳۰۳ ،

پ

پنجاب ۱۱ ، ۳۶۴ ،

پانی پت ۹۰ ،

پرتگال ۸۵ ،

ت

تھانہ ۹۰ ،

ج

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی ۲۹ ،

جوبلی بھون بمبئی ۵۰ ،

جامعہ اسلامیہ دلی ۶۶ ،

جزیرہ انڈمان ۹۲ ،

جے پور ۸۲ ،

جبل پور ۱۷ ،

چ

چین ۲۱۳ ، ۳۶۳ ،

ح

حیدرآباد دکن ۵۱ ، ۵۲ ، ۳۶۵ ،

خ

خضرآباد ۱۱۸ ،

د

دہلی ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۲۶ ، ۲۷ ،
۳۴ ، ۳۹ ، ۴۴ ، ۵۶ ، ۸۴ ، ۸۵ ،
۸۷ ، ۸۸ ، ۹۰ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۴ ،
۲۵۹ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۱۷ ، ۳۴۶ ،
۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۳۶۲ ،

ر

راجستھان۔ ۱۱ ، ۱۷ ، ۱۳ ، ۴۹ ،
۹۱ ، ۹۲ ، ۹۴ ،
رضا لائبریری رام پور ۴۹ ، ۲۸۲ ، ۳۲۸ ،
رام پور۔ ۶۲ ، ۳۶۰ ، ۳۶۵ ، ۳۶۶ ،
روم ۳۶۵ ،

س

سمرقند ۸۲ ،

ش

شمالی ہند ۸۸ ،
شملہ بازار ۸۷ ،
شام ۳۶۵ ،

ص

صفاہان ۶۶ ، ۶۷ ،

ط

طور ۱۵۵ ، ۲۰۶ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶ ، ۲۷۷ ،
۳۰۲ ،

ف

فیروزپور ۴۵ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۸ ،
فخر المطابع دلی ۹۱ ،

ق

قُلزم ۲۹۰ ،

ک

کینیا مشرقی افریقہ ۱۲ ،
کانپور ۸۶ ،

کعبہ ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۳۴، ۲۴۰،
۲۸۲، ۲۹۵، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۴، ۳۲۵،
۳۳۰، ۳۳۸، ۳۶۰،
کلکتہ ۳۹، ۴۱، ۸۶، ۸۷،
۹۰، ۹۴، ۲۷۵،
کراچی ۲۸۲،
کوثر ۱۵۶، ۱۶۹، ۱۰۷،
کربلا ۳۲۸،

گ

گروتالاب
گوڑگانواں ۳۶۲،

ل

لاہور ۸۲،
لوہارو ۳۶۱، ۳۶۶،

م

مطبع فروغ اردو لکھنؤ ۱۴،
مطبع کراچی ۱۶،
مہرولی ۴۴،
مکہ ۴۷، ۳۰۳،
مجلس پریس دہلی ۹۳،

مرکزی اردو بورڈ لاہور ۳۳،
مرادآباد ۱۶، ۱۷،
مدینہ ۴۷،
مصری لال پریس ہاتھرس ۳۳،
مطبع مصطفائی ۹۴،
مطبع احمدی ۲۱، ۹۲،
" منشی سنت پرشاد آرہ ۹۵،
" دارالسلام دہلی ۲۱، ۴۳، ۸۹،
" احمدی باہتمام اموجان ۷۷، ۷۸،
" ملٹی پرنٹ کمپنی ۵،
مطبع نظامی کانپور ۹۳،
" نبوی کلکتہ ۹۶،
" سراجی دہلی ۹۵،
" سلطانی دہلی ۸۹، ۹۱،
" سیدالاخبار دہلی ۲۱، ۶۰، ۶۶، ۸۹،
" مفید خلائق آگرہ ۲۱، ۹۲، ۹۳،
" نظامی بدایوں ۶۱، ۶۲،
" " کانپور ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۹۳،
" مظہر العجائب، کلکتہ ۹۴،
" نولکشور لکھنؤ ۳۰، ۶۳، ۹۳، ۹۴، ۹۵،

مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی۔ ۹۴،

〃 مجتبائی میرٹھ ۹۵،

〃 محمدی (دہلی) ۹۴، ۹۵،

مرزاپور ۳۶۷،

مصر ۳۱۳،

ن

نولکشور ۴۹، ۵۱،

نیل ۱۲، ۸۲، ۸۷، ۲۴۵،

نجف ۱۵۴ ۲۰۶ ۲۱۲ ۲۱۵

ہ

ہندوستان ۲۶۹ ۳۶۲،

ہندوسند ۳۶۲، ۳۶۵،

ی

یورپ ۹۴،

کتب و رسائل وغیرہ

آ

آب حیات - ۱۱، ۴۴، ۵۴، ۲۹۴، ۲۸۴،

آمدنامہ ۳۴۴،

آثارِ غالب ۳۰۳،

ا

انوارِ سہیلی ۱۱،

انتخابِ غالب ۲۳، ۲۴، ۲۸۲،

ارمغانِ غالب ۵۰، ۳۲۶،

الناظر ۵۱،

اردوئے معلیٰ ۹۶، ۳۴۶،

احوالِ غالب ۳۶۲،

اخبار لدھیانہ ۳۶۴،

اردو اخبار دہلی ۳۰۴، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷،

اسعد الاخبار ۲۹۹،

ب

بوستان ۱۱،

بالِ جبریل ۲۱۶،

باغِ مہر ۲۵۱،

پ

پارسی سرایانِ کشمیر ۳۰۔

پنج آہنگ ۱۹، ۸۸، ۹۵، ۳۰۰۔

ت

تذکرہ کاملانِ رامپور ۱۶،

تذکرہ عیار الشعراء ۲۳، ۲۴، ۴۰،

(نیز دیکھیے عیار الشعرا)

تذکرہ عمدہ منتخبہ ۲۳، ۳۳، ۴۵، ۴۶،

(نیز دیکھیے عمدۂ منتخبہ)

تیغ تیز ۹۵،

تذکرہ شمع انجمن ۳۰۔

تکشفِ حکمت ۳۵۲

ج

جائزہ مخطوطاتِ اردو ۳۲

ح

حُسنِ خیال ۲۷ ، ۳۱ ، ۳۲ ،

خ

خطوطِ غالب ۲۵۳ ،

د

دیوانِ غالب ۱۳ ، ۱۷ ، ۱۹ ، ۲۰ ،
۲۱ ، ۲۲ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۵ ،
۲۵ ، ۳۲، ۴۴، ۴۷ ، ۵۱ ۵۶ ، ۵۷ ،
۶۰ ، ۶۱ ، ۶۱ ، ۶۴ ، ۶۲ ، ۶۳ ،
۶۴ ، ۶۶ ، ۶۸ ، ۶۸ ، ۷۰ ، ۷۴
۷۴ ، ۷۵ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۸۱ ، ۸۹ ،
۹۲ ، ۹۳ ، ۲۹۱

دیوانِ ظفر ۳۱۸ ،

دستور العملِ اودھ ۳۲۸ ،

دیوانِ معروف ۲۵۳ ،

دیوانِ ذوق ۵۲ ،

درفشِ کاویانی ۹۴ ،

دافعِ ہذیان ۹۳ ،

دُعائے صباح ۹۴ ،

دیوانِ ناظم ۴۳

دیوانِ غنی ۲۹ ،

دستنبو ۹۲ ، ۹۴ ، ۹۵ ،

دیوان فارسی ۶۹ ، ۹۳ ،

ر

رسالہ مخزن ۴۶ ،

رسالہ اُردوئے معلیٰ ۵۰ ،

رسالہ تحفہ حیدرآباد - دکن ۵۱ ،

رسالہ ادیب ۵۲ ،

رسالہ دہلی سوسائٹی ۳۶۲ ،

رسالہ طوفاں ۳۳۰ ،

ریاض الامراء ۳۲۵

س

ساطعِ برہان ۹۳ ، ۹۴ ،

سبدِ چین ۹۵ ،

سہ ماہی اردو اورنگ آباد - ۲۷ ، ۳۱ ، ۳۲ ،

سوالات عبدالکریم ۹۳ ،

سید الاخبار ۳۰۲ ،

ش

شرحِ دیوانِ غالب از نظامی ۴۶ ،

ص

صادق الاخبار ۹۲ ،

ع

عمدہ منتخبہ ۳۵ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۴۰ ،
۱۰۱ ، ۱۰۴ ، ۱۰۶ ، ۱۰۷ ، ۱۰۸ ،
(نیز دیکھیے تذکرہ عمدہ منتخبہ)

عودِ ہندی ۹۵ ، ۱۰۹ ،

عیار الشعرا۔ ۸۴ ، ۱۰۱ ، ۱۰۸ ، ۳۱۷ ،
(نیز دیکھیے تذکرہ عیار الشعرا)

غ

غالب کے خطوط ۵۶ ،

غالب از مہر ۳۰ ، ۳۱ ،

غالب تقلید و اجتہاد ۱۸ ،

غالب ۶۲ ،

ف

فرہنگِ آصفیہ ۲۴ ،

فرہنگِ آنند راج ۳۰ ، ۳۱ ،

ق

قادر نامہ۔ ۲۲ ، ۹۱ ، ۹۳ ، ۳۱۶ ،
۳۳۹ ، ۳۴۴ ،

قاطع برہان ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۵ ،

قاطع القاطع ۹۴ ،

ک

کلیات نثر فارسی۔ غالب ۹۵ ،

کلیات اقبال ۵۱ ،

گ

گلستان (سعدی) ۱۱ ،

گفتارِ غالب ۷۵ ،

گلستانِ بے خزاں ۸۴ ،

گل رعنا قلمی اور مطبوعہ۔ ۲۳ ، ۲۶۸ ،

گلشنِ بے خار ۲۸۳ ،

گلدستۂ انجمن ۳۶۲ ،

ل

لطائفِ غیبی ۵۶ ، ۹۳ ،

م

مثنوی مولوی معنوی ۳۱ ،

مخطوطہ (دیوان غالب) بیگم تاباں ۳۹ ،

مکتوباتِ امیر مینائی ۴۲ ،

مثنوی ابر گہر بار ۹۳ ،

محرق قاطع برہان ۹۳ ،

مہرِ نیمروز ۸۹ ، ۹۱ ، ۹۵ ،
مویدِ برہان ، ۹۴ ۹۵

ن

نسخۂ شیرانی ۔ ۱۲ ، ۱۸ ، ۲۳ ،
۳۵ ، ۳۷ ، ۳۹ ، ۲۴۹ ، ۲۶۸ ،
نسخۂ بھوپال بخطِ غالب ۔۱۸ ، ۲۳ ، ۳۵ ،
۳۵ ، ۳۷ ، ۴۰ ، ۱۱۱
نامۂ غالب ۹۴ ،
نسخۂ رام پور ۲۳ ، ۲۴ ،
نسخۂ بدایوں ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۸۲ ،
نسخۂ دیسنہ ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۹۲ ،
نسخۂ لاہور ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۸۹ ،
نسخۂ کریم الدین یا نسخۂ کراچی ۔ ۲۳ ، ۲۴ ،
۲۸۲ ،
نسخۂ رام پور ۲۳ ، ۲۴ ، ۴۶ ،
نسخۂ عرشی ۲۴ ، ۴۲ ،
نسخۂ تذکرہ گلزارِ سخن ۴۹ ،
نسخۂ بھوپال ۴۹ ،
ن۔م راشد ۔ ایک مطالعہ ۳۰ ،
نکاتِ غالب واقعاتِ غالب ۹۵ ،
نسخۂ امروہہ (بھوپال) بخطِ غالب ۵۳ ،

ہ

ہنگامۂ دل آشوب (۱) (۲) ، ۹۵ ،

ی

یادگارِ غالب ۱۱ ، ۱۵ ، ۱۷ ، ۲۶ ،
۲۷ ، ۳۱ ،
یوسفِ ہندی قیدِ فرہنگ میں ۱۱ ، ۱۲ ،
یادگارِ غالب ۲۴۶ ،